فکر و نظر

بزدلی یا مصلحت پسندی

حکمرانوں کی بزدلی

ملک میں دہشت گردی کی کارروائیاں ہوں یا فرقہ وارانہ فسادات ہمارے حکمرانوں میں سے بعض اسے تسلیم کرتے رہے ہیں کہ ان کے پیچھے غیر ملکی ہاتھ ہے۔ پھر حالات کا جبر اس غیر ملکی ہاتھ کو بھی واضح کرتا رہا ہے۔ اخبارات اور میڈیا میں یہ باتیں کھلم کھلا آتی رہی ہیں کہ پاکستان نے بھارت کو بلوچستان میں مداخلت کے ثبوت دیے ہیں اور یہ مسئلہ بھارت کے ساتھ زیر بحث آیا ہے۔ پاکستان نے طالبان سے مذاکرات کی پالیسی اپنائی تو امریکہ نے ڈرون حملے میں طالبان لیڈر کو مار کر اور مذاکرات کو سبوتاژ کر کے اپنی پاکستان دشمنی واضح کر دی۔ گویا ملک بھر میں اور خصوصاً کراچی، کوئٹہ، پشاور اور قبائلی علاقوں میں جس دہشت گردی اور فرقہ وارانہ فسادات اور ان میں جس غیر ملکی ہاتھ کا ذکر کیا جاتا تھا وہ ڈھکا چھپا نہیں، وہ امریکہ و بھارت اور ان کے حلیف ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہماری سیاسی اور عسکری قیادت کیوں اتنی بزدل ہے کہ وہ دشمن کو دشمن نہیں کہتی اور اس سے دشمنوں جیسا سلوک نہیں کرتی؟ یہ ۲۰ کروڑ لوگوں کا ملک ہے، ایٹمی ہتھیاروں سے لیس ہے، بڑی اور منظم بری، بحری اور فضائی افواج موجود ہیں، سوال یہ ہے کہ آپ نے کیوں اپنے آپ کو تنکے کی طرح ہلکا سمجھ لیا ہے؟ گرم جنگ تک نوبت پہنچنے سے پہلے سرد جنگ کا طویل مرحلہ آتا ہے اور یہ اعصاب کی جنگ ہوتی ہے۔ آپ ایک فون کال پر کیوں ڈھیر ہوتے ہیں؟ آپ دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کیوں بات نہیں کر سکتے؟ آپ امریکہ کو دھمکی دیں کہ اب ڈرون آیا تو ہم گرا دیں گے۔ آپ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہیں کہ یہ ہمارے ملک پر حملہ ہے، ہم اسے برداشت نہیں کریں گے۔ اگر آپ امریکیوں کو باور کرا دیں کہ آپ ڈرون گرا دیں گے تو ہمیں یقین ہے اور ۹۹ فیصد امکان ہے کہ آئندہ ڈرون حملہ نہیں ہوگا۔ آپ اپنی آزادی اور خودمختاری کے لیے کیا ایک فیصد رِسک بھی نہیں لے سکتے؟ سیاست دانوں کو بھی بزدل نہیں ہونا چاہیے لیکن ہمیں حیرت ہوتی ہے اپنے جرنلوں، ائیر مارشلوں اور ایڈمرلوں پر کہ وہ کیسے پاکستانی سرزمین پر حملے برداشت کرتے ہیں کیونکہ ان کی تو ٹریننگ ہی ملک کے لیے لڑنے، مرنے اور مارنے کی ہوتی ہے؟

فرقہ وارانہ فسادات میں بعض مسلمان ملکوں کا نام بھی دبے لفظوں میں لیا جاتا رہا ہے اور اس ضمن میں ایران، سعودی عرب و امارات کی طرف اشارے کیے جاتے رہے ہیں۔ حکومت کے پاس ذرائع ہیں اور وہی اس طرح کی خبروں کی تصدیق کر سکتی ہے۔ اگر اس میں حقیقت ہو تو ان دوست ممالک (؟) کو بھی شٹ آپ کال جانی چاہیے اور اس کا انسداد کرنا چاہیے۔

علماء کی مصلحت پسندی

ہمارے جمہور علماء کرام کا رویہ بھی مصلحت پسندی کا رہا ہے، فرقہ واریت کے حوالے سے بھی اور ہماری سیاسی اور عسکری قیادت کے امریکہ سے حلیفانہ تعلقات اور طالبان کے بارے میں بھی۔

فرقہ واریت کے حوالے سے معاملہ یہ ہے کہ اگرچہ اس میں غیر ملکی ہاتھ ملوث ہے لیکن ظاہر ہے کہ غیر ملکی قوتوں کو مقامی گماشتے بہرحال علماء اور مسالک کی صفوں ہی سے ملتے ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے علماء کی اکثریت معتدل مزاج ہے اور مسلک پرستانہ اور فرقہ وارانہ انداز میں سوچنے والے کم ہیں لیکن دقت یہ ہے کہ یہ جمہور علماء اپنے مسلک کے انتہا پسندوں کی مذمت نہیں کرتے اور ان سے اظہار برأت نہیں کرتے۔ اگر یہ ان کی مذمت کریں، ان سے اظہار برأت کریں اور یہ اعلان کریں کہ یہ ہم میں سے نہیں اور ان کی حوصلہ شکنی کریں اور ان کا بائیکاٹ کریں تو لازماً ان عناصر کی حوصلہ شکنی ہو، فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں رخنہ نہ پڑے اور ماحول پرسکون رہے۔ ہر مسلک کے جمہور، معتدل اور بزرگ علماء کرام کو چاہیے کہ وہ اپنے مسلک کے انتہا پسندوں اور غیر ملکی ہاتھوں میں کھیلنے والوں سے اعلان برأت کریں اور ان کی مذمت کریں۔

ہماری سیاسی اور عسکری قیادت نے دہشت گردوں کے خلاف نام نہاد امریکی جنگ میں (جو دراصل امریکہ و یورپ کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ ہے) اہل مغرب کا ساتھ دے کر جو اپنا یعنی ملک و ملت کا نقصان کیا ہے اور جنگ میں کفار کا ساتھ دینے پر ان کے اعمال کی جو شرعی حیثیت بنتی ہے، علماء کرام نے اس کے بارے میں بھی دوٹوک موقف اختیار کرنے سے گریز کیا ہے اور دبے لفظوں میں ہی اس کی مذمت کی ہے کہ یہ قومی خودمختاری کے خلاف ہے، یہ پرائی جنگ ہے اس سے نکلا جائے......وغیرہ وغیرہ

یہی رویہ جمہور علماء اور دینی عناصر کا طالبان پاکستان کے بارے میں بھی ہے کہ اپنے اس موقف کے باوجود کہ ایک مسلم ملک میں غلبۂ دین کا کام پرامن ذرائع سے ہی ہونا چاہیے، ان کا رویہ طالبان کے ساتھ ہمدردانہ اور دوستانہ ہے کیونکہ وہ ان کے نفاذ شریعت کے مطالبے اور امریکی مخالفت سے متفق ہیں

لیکن انہوں نے اس بارے میں دوٹوک موقف اختیار نہیں کیا کہ نفاذ شریعت کے پرامن ذرائع کی موجودگی میں مسلح جدوجہد کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور خصوصاً اس وقت جب کفار بھی اس میں گھل مل گئے ہوں نیز طالبان کا اصل ہدف کفار (امریکہ اور بھارت) ہونے چاہئیں نہ کہ پاکستان۔

مندرجہ بالا امور میں علماء کرام کے اس رویے کو جسے ہم نے مصلحت پسندی کہا ہے، ان کے مخالف اسے بزدلی اور مداہنت سے تعبیر کرتے ہیں جب کہ ان کے حامی اسے حکمت اور حکمت عملی کہتے ہیں۔ حال ہی میں طالبان رہنما کو شہید کہنے کے حوالے سے جو تند و تیز بحث ہمارے ہاں چلی اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ علماء کرام اور دینی عناصر نے مصلحت پسندی سے کام لیتے ہوئے امور بالا میں کوئی دوٹوک، واضح اور متفقہ موقف اختیار کرنے سے گریز کیا ہے۔ اگرچہ یہ کام دس سال پہلے ہو جانا چاہیے تھا لیکن ہماری رائے میں اب بھی اس امر کی ضرورت ہے کہ سب مسالک کے جمہور، ثقہ اور بزرگ علماء کرام مل بیٹھیں اور مذکورہ بالا تینوں امور کے بارے میں واضح اور دوٹوک موقف اختیار کریں۔

اسلام اور پاکستان　　　ڈاکٹر محمد امین

آیئے، اس معاشرے کو بدل دیں
اصلاح وخدمت کے لیے ایک نئی تحریک کی ضرورت ہے

مخاطَب کون؟

اس تحریر کے مخاطَب ہیں:

۱۔ سول سوسائٹی کے وہ افراد جو دین کا درد رکھتے ہیں یا معاشرے کو بدلنا چاہتے ہیں جیسے پروفیسرز، اساتذہ، وکلاء، ڈاکٹرز، انجینئرز اور خصوصاً نوجوان اور طلبہ وطالبات

۲۔ علماء کرام

۳۔ دعوتی وتبلیغی جماعتوں کے افراد

۴۔ دینی سیاسی جماعتوں کے کارکن

بنیادی فکر

۱۔ معاشرے میں تبدیلی کی بنیاد اسلامی تعلیمات ہیں کیونکہ کوئی قوم اپنے نظریۂ حیات سے وابستہ ہوئے بغیر ترقی نہیں کرسکتی۔

۲۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبروں خصوصاً آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی اصلاح وہدایت کے لیے تین نکاتی فارمولا دیا گیا ہے یعنی:

۱۔ تعلیم کتاب　۲۔ تعلیم حکمت، اور　۳۔ تزکیۂ نفس

تاکہ ایسی شخصیت پروان چڑھ سکے جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزار سکے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا سے متمتع ہوسکے۔

۳۔ جو کلمہ پڑھ کر ہم مسلمان ہوتے ہیں یعنی لا الـہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ ، اس میں نفی پہلے ہے اور اثبات بعد میں۔ گویا اللہ کی عبادت واطاعت اس وقت تک بے معنی ہے جب تک غیر اللہ کی عبادت واطاعت ترک نہ کی جائے، جس کا عصر حاضر میں سب سے بڑا مظہر ہے مغربی فکر وتہذیب جو الحاد

کی علمبردار اور اسلام و مسلمانوں کی کھلی دشمن ہے اور دنیا کی غالب تہذیب (اور دین) ہے لہٰذا مسلمان جب تک اس کی پیروی ترک نہ کریں اور اسے رد نہ کریں، اسلام کو اپنانے کا حق ادا نہیں کر سکتے۔

لائحہ عمل (تلخیصاً)

۱۔ نظام تعلیم و تربیت اور میڈیا کی اصلاح کے بعد ان کے ذریعے فرد کے ذہن و قلب اور فکر و عمل کی تطہیر و تعمیر کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق بسر کر سکے۔ گویا کام کے تین محور ہیں جن کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے اصلاح فرد، پھر اصلاح معاشرہ اور پھر اصلاح ریاست۔

۲۔ پہلے دونوں محوروں پر نتیجہ خیز کام کیے بغیر تیسرے محور یعنی ریاستی سطح پر دیرپا تبدیلی نہیں لائی جا سکتی اور ریاستی سطح پر تبدیلی میں چونکہ عالم کفر کی دنیا پر غالب قوتیں بھی مزاحم ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ پہلے محور پر کام کرتے ہوئے دوسرے محور پر منظم انداز میں ترکیز کی جائے تا کہ اگر ریاستی سطح پر فوری تبدیلی نہ بھی لائی جا سکے تو معاشرے کی سطح پر وہ تبدیلی جڑ پکڑ سکے۔ اس کا عنوان ہم نے خدمت خلق رکھا ہے اور اس کے لیے ہماری تجویز یہ ہے کہ مسجد کو مرکز بنا کر خدمت خلق کے تین شعبوں میں ابتداءً مندرجہ ذیل کام کیے جائیں:

۱۔ افلاس کم کرنے کے لیے: محلے کے غربا و مساکین اور یتیم و بیوگان کی مالی اعانت

۲۔ فراہمی عدل و انصاف کے لیے: مصالحتی/عدالتی کمیٹی بنا کر شریعت کے مطابق فیصلوں کا اہتمام۔

۳۔ بحالی امن و امان کے لیے مسجد امن کمیٹی کے ذریعے ہر گلی میں پہرے کا انتظام

تیسرے محور پر دینی سیاسی جماعتیں کام کر رہی ہیں لیکن پہلے دو محوروں پر کام کم اور غیر موثر ہے لہٰذا ہم عوام و خواص کی توجہ ان کی طرف مبذول کرا رہے ہیں۔

مجوزہ تحریک اصلاح و خدمت کی تفصیل

ضرورت

مسلمانوں کو اچھا اور باعمل مسلمان بنانے اور پاکستانی معاشرے اور ریاست کو اسلام کے مطابق چلانے کے لیے ہمارے معاشرے میں اس وقت تین بڑے دائروں میں کام ہو رہا ہے: ۱۔ دعوتی، تبلیغی اور اصلاحی جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ ۲۔ علماء کرام دینی مدارس اور مساجد کے ذریعے سعی کر رہے ہیں اور دینی سیاسی تحریکیں ریاستی قوت کو اسلام کے حق میں استعمال کرنے کی خاطر جدوجہد کر رہی ہیں۔ ان تین

دائروں میں ان کی جدوجہد کے مثبت اثرات بھی موجود ہیں جس کے لیے وہ مستحق تحسین ہیں......لیکن یہ بھی ایک تلخ لیکن ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ان قوتوں کی مذکورہ مثبت کوششوں کے باوجود بگاڑ دن بدن بڑھ رہا ہے، لوگ دین سے دور ہورہے ہیں، مغربی اقدار معاشرے پر حاوی ہورہی ہیں اور ریاستی قوت بے دینی کے حق میں استعمال ہورہی ہے جس سے فرد بےسکون، معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار اور ریاست عدم استحکام سے دوچار ہے۔ یہ حالات تقاضا کرتے ہیں کہ:

ا۔موجودہ کاموں اوران کے طریق کار پر نظر ثانی کی جائے اور انہیں بہتر اور موثر بنانے کی کوشش کی جائے۔

۲۔کام کرنے کے نئے منہاج دریافت کیے جائیں تاکہ جن شعبوں میں کام نہیں ہورہا، وہاں کام ہو۔ یا جہاں کام کم اور غیر موثر ہے وہاں زیادہ کام ہو اور موثر ہو۔اس تحریر میں تجویز کردہ کاموں کی نوعیت اسی دوسری قبیل کی ہے۔

حکمت وافادیت

ا۔ ہم جن کاموں کے کرنے کی تجویز دے رہے ہیں ان کی نظری بنیاد یہ ہے کہ کام کے تین محور ہیں: ا۔فرد ۲۔معاشرہ؛ اور۳۔ریاست تاہم پہلا کام یعنی تعمیر فرد تینوں کاموں کی بنیاد اور پہلی سیڑھی ہے۔اگر فرد کی تعلیم وتربیت یا قرآنی اصلاح میں تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس کا کام قرآنی اصولوں کے مطابق وسیع، جامع اور متوازن انداز میں کیا جائے تو معاشرے اور ریاست کی اصلاح اور تعمیر کا کام بھی ہونے لگے گا اور اس کے کرنے کے لیے موزوں افراد کار بھی مہیا ہونے لگیں گے کیونکہ یہ کام بھی عین مطلوب ہے۔

۲۔ جوکام درکار ہے وہ دراصل اصلاح ہی کا ہے کیونکہ مسلمان بھی موجود ہیں، ان کا معاشرہ بھی موجود ہے اور ان کی ریاست بھی۔لہٰذا ہمیں کوئی ادارہ عدم سے وجود میں نہیں لانا کہ لوگوں کو مسلمان بنانے ☆، مسلم معاشرہ قائم کرنے اور مسلم ریاست کے قیام کی جدوجہد ہمیں درپیش ہو بلکہ مسلمان بھی موجود ہیں، ان کا معاشرہ بھی موجود ہے اور ان کی ریاست بھی موجود ہے۔ہاں! نہ مسلمان معیاری مسلمان ہیں، نہ ان کا معاشرہ معیاری مسلم معاشرہ ہے اور نہ ان کی ریاست معیاری مسلم ریاست ہے لہٰذا جو چیز مطلوب ہے وہ یہ کہ ان تینوں کی اصلاح کی جائے کہ وہ کماحقہ اسلامی حقوق ادا کرنے اور اسلامی تقاضے پورے کرنے لگیں۔

☆ اگر چہ اسلام کی اشاعت اور غیر مسلموں تک دین پہنچانا بھی مطلوب ہے۔

۳۔ اسلامی ترتیبِ اصلاح یعنی پہلے فرد، پھر معاشرہ اور پھر ریاست انتہائی حکمت پر مبنی ہے کیونکہ اگر فرد کی اصلاح تعلیم کتاب وحکمت وتزکیہ کے اصول پر، کماحقہٗ ہوجائے تو وہ ان شاء اللہ دنیا میں اپنی زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزارے گا اور آخرت میں رضائے الٰہی سے متمتع ہوگا جو ایک مسلمان کی سب سے بڑی غایت ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے کوشش کرنی چاہیے کہ دوسرے مسلمانوں کی بھی اصلاح ہو تا کہ پورا معاشرہ اسلامی تقاضوں کے مطابق کام کرنے لگے اور اس کے نتیجے میں ریاست کی بھی اصلاح ہوجائے اور وہ بھی اسلامی تقاضوں کے مطابق کام کرنے لگے کیونکہ معاشرہ افراد ہی سے مل کر بنتا ہے اور ریاست کو بھی افراد معاشرہ ہی چلاتے ہیں تاہم دوسرے اور تیسرے محور کے لیے اگر ضرورت ہو تو الگ تنظیمیں اور ادارے بھی بنائے جاسکتے ہیں۔

اس قرآنی ترتیب اور سپرٹ کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو دینی تحریکیں تیسرے محور یعنی ریاست کی اصلاح کے لیے کام کررہی ہیں وہ پہلے دونوں محوروں پر توجہ نہیں دے پائیں اور جو علماء کرام اور دعوتی، اصلاحی اور تبلیغی جماعتیں ہمارے ہاں کام کررہی ہیں وہ اگرچہ اصولاً پہلے محور یعنی اصلاح وتعمیر فرد کے لیے کام کررہی ہیں لیکن ان کا منہج ناقص ہے جس کے نتیجے میں دوسرے اور تیسرے محور پر ان کے اثرات نہیں پڑ رہے اور معاشرہ دن بدن اسلامی لحاظ سے سقیم اور کمزور ہوتا چلا جارہا ہے۔

مجوزہ لائحۂ عمل

مندرجہ بالا بحث سے مطلوب کام کا منہج واضح ہوجاتا ہے:

ایک تو یہ کہ سب مسلمانوں کو توجہ دلائی جائے کہ وہ پہلے اور دوسرے محور پر کام کریں خصوصاً وہ لوگ جو کسی منہج پہ بھی کام نہیں کررہے بالخصوص نوجوان جنہوں نے ابھی کارزارِ حیات میں قدم رکھنا ہے اور ان میں قوتِ کار کی بھی فراوانی ہے۔

دوم: تیسرے محور پہ کام کرنے والوں کو توجہ دلائی جائے کہ وہ پہلے دو محوروں کو نظرانداز نہ کریں خصوصاً پہلے محور پر تو ضرور ہی توجہ مرکوز کریں اور پہلے محور پر ناقص انداز میں کام کرنے والوں کو توجہ دلائی جائے کہ وہ یہ کام اس طرح کریں کہ دوسرے اور تیسرے محور پر بھی اثرانداز ہوں۔

ہم مسلمانوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ کفر کی بین الاقوامی طاقتوں نے مسلم ریاستوں اور ان کے حکمرانوں کو نرغے میں لے رکھا ہے اور وہ مسلم قوتوں کی دال نہیں گلنے دے رہیں لہٰذا

اس کا بہترین متبادل یہ ہے کہ پہلے محور پر کام کرتے ہوئے دوسرے محور کو سنبھال لیا جائے کیونکہ اتفاق سے مغربی قوتوں نے جو نظام مسلم ممالک پر مسلط کر رکھا ہے اس میں بھی دوسرے محور پر کام کرنے کی گنجائش موجود ہے اور پرائیویٹ سیکٹر میں تعلیم اور میڈیا کے علاوہ افلاس کے خاتمے، انصاف کے حصول اور بحالیٔ امن وامان......وغیرہ کے لیے منظّم اور ادارتی کوششیں کی جاسکتی ہیں جن میں ریاست کی مزاحمت کا امکان کم ہے۔ یہی اپروچ ہمارے اس لائحہ عمل کی بنیاد ہے۔

لائحہ عمل

اصلاح فرد کے لیے

تعلیم اور میڈیا کی اصلاح کی جائے اور اس کے بعد انہیں فرد کی اصلاح وتعمیر کے لیے استعمال کیا جائے۔

تعلیم کی اصلاح کے سلسلے میں عرض ہے کہ جدید یا عمومی تعلیم کی اصلاح کی بھی ضرورت ہے اور دینی مدارس کی تعلیم کی بھی۔ جدید تعلیم مغرب زدہ ہے اور بگاڑ کا بڑا ذریعہ ہے۔ اسلامی تناظر میں اس کی تشکیل نو کی ضرورت ہے۔ اس میں موثر مذہبی تعلیم وتربیت کو شامل کرنا ضروری ہے اور جدید علوم (خصوصاً عمرانی علوم) کی اسلامی تناظر میں تدوین نو درکار ہے۔ اساتذہ کی تربیت اور ہم نصابی سرگرمیوں کو اسلامی حوالے سے منظّم کرنا بھی ناگزیر ہے۔

دینی مدارس کی تعلیم کی اصلاح وتجدید بھی درکار ہے تاکہ طلبہ معاصر علوم سے بے خبر نہ رہیں اور اسلامی علوم کی تدریس اس سطح کی ہو کہ وہ عصری ضرورتوں کو پورا کر سکے اور فرقہ واریت سے مبرا ہو۔ نیز یہ صرف مسجد اور مدرسے کے لیے ہی افراد کار مہیا نہ کرے بلکہ مسلم معاشرے اور ریاست کو کارکن بھی اس سے میسر آنے چاہئیں۔ دونوں طرح کے تعلیمی دھاروں کا نتیجہ موثر تربیت کے ساتھ بہرحال یہ نکلنا چاہیے کہ ایک مستحکم اور متوازن مسلم شخصیت وجود میں آئے جو عصری تحدیات اور تقاضوں کو پورا کر سکے۔

میڈیا

مغرب زدہ بلکہ مغرب کا آلہ کار میڈیا مسلم معاشرے کی بربادی کا غالبًا سب سے موثر ذریعہ ہے لہٰذا نہ صرف اس کے ضرر سے بچنا ضروری ہے بلکہ اس کا ایسا استعمال بھی ضروری ہے جس سے اسلامی تناظر میں تعمیر فرد کا کام لیا جاسکے۔ بدقسمتی سے دینی قوتوں کی توجہ اس طرف کم ہے لیکن جب تک وہ

الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا خصوصاً سوشل میڈیا پر موثر کام نہیں کریں گے، موجودہ معاشرے خصوصاً اس کی نوجوان نسل پر اسلامی حوالے سے اثر انداز ہونا ان کے لیے مشکل تر ہوتا چلا جائے گا۔

اصلاح معاشرہ

ہم نے بطور سمبل اور بطور سیمپل خدمت خلق کے عنوان کے تحت اصلاح معاشرہ کے تین پہلوؤں پر کام کرنے کی تجویز دی ہے، اگرچہ بھرپور سماجی تبدیلی (Social Change) کے لیے دوسرے شعبوں میں بھی کام کی ضرورت ہے:

افلاس کا خاتمہ: ابتداءً محلے کی مسجد میں ایک کمیٹی بنالی جائے جو محلے کے غربا و مساکین اور یتیم و بیوگان کی مالی مدد کرے۔

فراہمی انصاف: ایک مسجد عدالتی کمیٹی جو ایک عالم دین، ریٹائرڈ جج، دین دار وکیل......وغیرہ پر مشتمل ہو، مصالحتی اور ثالثی......وغیرہ کے ذریعے، اسلامی اصولوں کے مطابق جھگڑے نمٹانے کا کام کرے، خصوصاً مظلومین اور مقہورین کی مدد کرے۔

بحالی امن و امان: مسجد میں ایک امن کمیٹی ہو جو گلی محلے میں پہرے کا انتظام کرے تاکہ چوری، ڈکیتی اور سٹریٹ کرائمز سے بچا جا سکے۔

اس لائحہ عمل کی تفصیلات ہماری دیگر تحریروں میں بھی موجود ہیں جہاں ان شعبوں میں مزید اقدامات کا بھی ذکر ہے مثلاً افلاس میں کمی کے لیے مرکزی زکوٰۃ کونسل بنا کر زکوۃ کے جمع و تقسیم کا کام سنبھالنا، غیر سودی کاروبار منظم کرنا، عدالتی کمیٹیوں کو شہروں اور گاؤں کی سطح تک منظم کرنا اور عدالت ہائے اپیل بنانا...... وغیرہ تاہم اس تعارفی تحریر میں ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں ۔ ایک کتاب اس موضوع پر زیر طبع ہے جو تفصیل سے اس موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے دفتر البرہان سے رابطہ کیا جائے۔

تعلیم و تربیت

اللہ داد نظامی ☆

عمرانی علوم (آرٹس) سائنس سے اہم تر ہیں

عہد جدید میں بے شمار سائنسی ایجادات و اکتشافات نے انسان کو حیران زدہ کر دیا ہے اگر چہ حضرت انسان نے اپنی حیرتوں کا یہ سامان خود ہی کیا ہے۔ موجودہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور کہلاتا ہے اور بجا کہلاتا ہے۔ برسرزمین حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی ایک نعرے کی حیثیت اختیار کر گئی ہے اور پسماندہ مشرق میں مغرب سے مرعوب ذہنوں نے ضرورت سے زیادہ ہی اس کا غلغلہ بلند کر رکھا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مغرب کی بالادستی میں اس کے سائنس دانوں کا زبردست ہاتھ ہے اور مغرب کی لحظہ لحظہ دگرگوں صورت حال میں ٹیکنالوجی نے قیامت ہی بپا کر رکھی ہے لیکن اقبال نے سچ کہا تھا کہ ''ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی۔''

سوچنے والی بات یہ ہے کہ مغرب کے موجودہ تسلط کی وجہ سائنس و ٹیکنالوجی میں غلبہ ہے یا اس کے پیچھے کئی اور تاریخی عوامل کا دخل بھی ہے۔ بلاشبہ تحریک پاکستان کی روح تو دین سے محبت کرنے والے عوام تھے لیکن اس تحریک کے دماغ سرسید احمد خاں کی فکر سے ہی متاثر تھے۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ طبقہ سے ہمارے نظام تعلیم کی بدقسمتی کے دور کا آغاز ہوا اور قوموں کے عروج و زوال کے تاریخی عوامل کو ایک طرف رکھتے ہوئے ظاہر پرست نگاہوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کا شور و غوغا اس قدر بلند کیا کہ ہر معقول آواز دبتی چلی گئی اور قوم کی حرماں نصیبی میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ اگر تاریخ کا مطالعہ گہری نظر سے کیا جائے تو کسی محرم اسرار سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ قوموں کے عروج و زوال میں سائنس و ٹیکنالوجی نہیں علوم عمرانی بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ جنہیں عرف عام میں Humanities group یا زیادہ آسان الفاظ میں Arts group کہا جاتا ہے۔ قوموں کی قیادت، ان کی تعمیر و ترقی اور ان کے عروج و اقبال کا سب کچھ اس قوم کے وہ گل ہائے سرسبد ہوتے ہیں جو علوم عمرانی (آرٹس گروپ) میں بلندیوں کے نئے اُفق تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور وہ قوم علوم و فنون میں نئی بلندیوں کو چھو لیتی ہے اور حضرت اقبال کا یہ ارشاد صادق آ جاتا ہے کہ ؎

آ رہی ہے صدائے کن فیکون

پاکستان کے نظام تعلیم کا یہ المیہ ہے کہ ذہین، اہل، قابل اور محنتی طلبہ کو سائنسی تعلیم کی بھٹی میں ٹھونس

☆ بلال اسلامک سنٹر جھوک نواز (وہاڑی)

دیا جاتا ہے اور وہ علوم جو قوموں کے عروج وترقی کے لیے لازمی ہیں اور جو پاکستان کو قوموں کی صف میں ممتاز اور نمایاں کر سکتے ہیں ان علوم کے حصے میں غبی، کاہل، کند ذہن اور نااہل طلبہ آتے ہیں اور قوم کی قسمت ماتم کرتی رہ جاتی ہے۔ شاید اسی صورت حال کو منیر نیازی سمجھ نہ سکا اور چیخ اُٹھا ؎

منیر اس ملک پہ آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے

کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

آیئے! دلائل و براہین کے ساتھ اور خالصتاً ''سائنسی اندازِ فکر'' اپناتے ہوئے اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ سائنسی علوم یا علوم عمرانی میں اہمیت کس چیز کو حاصل ہے؟ تاکہ ملک کے ماہرین تعلیم ''مفکرین قوم''، اساتذہ کرام، ملکی قیادت، معزز والدین اور خود عزیز طلبا یہ فیصلہ کر سکیں کہ سائنس یا آرٹس میں پہلی ترجیح کس کو حاصل ہونی چاہیے۔

کہتے ہیں کہ ترجیحات کا صحیح تعین نصف سے زیادہ کامیابی کا باعث بنتا ہے۔

۱) قرآن اللہ کی کتاب ہے اور انسان کو جو قوت ارادہ واختیار دے کر بھیجا گیا ہے اور روح ارضی پر اس اختیار کے سبب جو شر وفساد اور خون ریزی فرشتوں کے ظن وتخمین میں سمائی، اس کا حل وتدارک یہی کتاب اللہ کرتی ہے۔ اگر ہم مسلمان ہونے کے ناطے اسے دل سے راہ نما مانتے ہوں تو ہم پر فرض ہے کہ اس کے مضامین پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں کہ یہ کتاب سائنسی علوم پر مشتمل ہے یا علوم عمرانی اس کے بنیادی موضوعات ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ازل سے ابد تک اس کرۂ ارض پر جو معرکہ روح وبدن گرم ہے اس میں سائنسی علوم ایک اہم شعبہ کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن کیا یہ پہلی ترجیح ہے؟ قرآن سے واقفیت رکھنے والا کوئی بھی فرد اس کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔ بلاشبہ خالق کائنات نے اپنی ذات کے عرفان کے لیے آفاق اور انفس پر غور کرنے کی بار بار دعوت دی ہے لیکن اس کے نتیجے میں بھی علوم عمرانی کے حقائق کی طرف سے دلائل کا رُخ موڑا گیا ہے۔

۲) کلام الٰہی کی ترجمانی کرنے والی انسانیت کی ان عظیم ترین ہستیوں کا ہم ذکر کرتے ہیں جن کے لیے ہماری زبانوں پر انبیاء کرام کے الفاظ آتے ہیں۔ ان پاکیزہ نفوس اور معصوم عن الخطا ہستیوں کی تمام تر جد وجہد کیا سائنس وٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے تھی؟ اگر کوڑھ مغزی کسی کا مقدر نہ ٹھہرا دی گئی ہو تو وہ اس سوال کا جواب اثبات میں نہ دے سکے گا۔ ایک اہم شعبہ حیات کے طور پر انبیائے کرام کی تعلیمات اور توجیہات میں سائنس وٹیکنالوجی کو اپنی وقعت کے مطابق اہمیت حاصل رہی ہوتی لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ انبیائے کرام کی تمام تر جد وجہد علوم عمرانی میں انسان کے رویے اور اس کے عملی کردار کے

حوالے سے اصلاح پر مرکوز رہی ہے۔ نبی آخرالزمان کی پوری زندگی کھلی کتاب کی طرح ماننے اور نہ ماننے والے دونوں کے سامنے ہے۔ آپ کی ۲۳ سالہ جدوجہد میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کو جو اہمیت حاصل رہی ہے اس کے بارے میں کچھ کہنے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ اصحاب صفہ مسجد نبوی ﷺ میں کیا تعلیم حاصل کرتے تھے اور وہ کن مضامین پر مشتمل تھی؟ اس بات سے حرف والفاظ سے رشتہ رکھنے والا ہر آدمی خوب واقف ہے۔ یہاں اس بات کی پھر وضاحت ضروری ہے کہ راقم الحروف کے نزدیک سائنس و ٹیکنالوجی کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ وہ زندگی کے لیے بالکل بے کار ہو لیکن جب یہ کہا جائے کہ اسے انسانی زندگی میں پہلی ترجیح حاصل ہے تو پھر شاید دور کی کوڑیاں لانے سے بھی بات نہ بن سکے۔ زندگی ایک اکائی ہے اور زندگی سے متعلقہ تمام علوم ایک دوسرے کے ساتھ گندھے ہوتے ہیں اور انسانی زندگی کو حصوں میں تقسیم کرنا ایک ناممکن العمل چیز ہے۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا ہے کہ علوم عمرانی کی تدریس و ترویج میں سائنس وٹیکنالوجی بذاتِ خود ایک اہم کردار ادا کرتی ہے لیکن بات پھر وہی ترجیح کے مسئلے پر آ کر رک جاتی ہے۔

قرآن اور انبیائے کرام کا معاملہ تو اعتقاد اور ایمانیات بالغیب سے تعلق رکھتا ہے اور شاید ہمارے کچھ دوست سائنسی طرزِ فکر کے حوالے سے ان چیزوں کو کوئی اہمیت دینے کو تیار نہ ہوں۔ ان کے مغرب پر ایمان بالغیب کا سہارا لیتے ہوئے اپنے موقف کے لیے کچھ دلائل پیش کریں گے۔

مغرب کی تاریخ میں ایسا عروج کبھی نہیں پایا گیا جو عصر حاضر میں اسے حاصل ہے اس کی بنیاد مغربی مفکرین کی وہ فکر ہے جس نے اپنی جگہ پر صحیح یا غلط ہونے کے سوال کے باوجود اپنے معاشرے کے ذہین اور قابل افراد کو متاثر کیا اور متحرک کر دیا۔ جس کے نتیجے میں جدید طرز کی ریاستیں وجود میں آئیں اور ان ریاستوں کے مدبرین اور قائدین نے پسماندہ قوم کو مغلوب کرنے کے لیے افکار اور سائنس و ٹیکنالوجی دونوں کا استعمال کیا اور یہ تسلط اپنے عروج پر پہنچا اور آج بھی مغرب میں سائنٹسٹ اور ٹیکنالوجسٹ پر مفکرین کا حق تنقید فوقیت رکھتا ہے اور تادم آخر مغرب کی تمام پالیسی اس کے مفکرین، مدبرین، سیاست کار اور سفارت کار تشکیل دیتے ہیں اور سائنس دان کی حیثیت محض آلہ کار کی رہی ہے اور شمار کی جاتی ہے۔ مغرب کی تاریخ کا ایک عبرت ناک واقعہ جنگ عظیم دوم میں جرمنی کی شکست کا ہے۔ جس سائنس دان نے ایٹم بم ایجاد کر کے امریکہ اور امن اتحادیوں کی فتح کو ہر طرح یقینی بنا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ صاحب جرمنی کے آمر ہٹلر سے ملے تھے اور ایٹم ایسے مہلک ہتھیار تیار کر دینے کی پیش کش کی تھی جسے ہٹلر نے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ بعد میں یہی سائنس دان امریکی مدبرین سے ملا اور ایٹم جیسے مہلک جنگی ہتھیار ایجاد کرنے کے لیے سہولیات اور فنڈز طلب کیے جسے امریکی قیادت نے پورا کیا۔ جنگ عظیم دوم

میں جرمنی اور امریکہ کی قیادت میں سے علوم عمرانی میں زیادہ بصیرت رکھنے والے نے ہی کامیابی اور فتح حاصل کی، سائنس دان کا کردار طفیلی ہی رہا۔

عہد حاضر میں جاپان سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے امریکہ اور یورپ سے بھی برتر ہے لیکن قوموں کی صف میں اس کا مقام ذلت ہی کا ہے اور اس سے جس قدر جاپانی قوم خود آگاہ ہے شاید ہی کوئی آگاہ ہو۔ جاپان بھر میں موجود امریکی چھاؤنیوں کے شیر بہادر فوجی جوان ۱۹۴۵ء سے آج تک جاپان کے شہروں، قصبوں اور گلیوں میں جاپانی قوم کی صنف نازک کو جب چاہتے ہیں بھرپور ''خراج تحسین'' پیش کرتے چلے آ رہے ہیں اور ''عظیم'' جاپانی قوم سائنس و ٹیکنالوجی کی نئی وسعتوں کو چھو رہی ہے اور امریکی بڑے ''کھلے دل'' سے تسلیم کرتے ہیں کہ جاپان سائنس و ٹیکنالوجی میں ہم سے ''بازی'' لے گیا ہے۔

تفو بر تو اے چرخ دوراں تفو

شاید کبھی جاپانی قوم کے لیے خوش قسمت دن آ جائے کہ اس کی قیادت علوم عمرانی کے حوالے سے انسانوں کے درمیان اپنے آپ کو پہچان سکے۔

دراصل سائنٹسٹ کا کردار ایک طفیلی کردار ہے اور وہ آلہ کار جو اپنی جگہ ایک اہمیت کی حامل چیز ہے کی حیثیت رکھتا ہے اور جب تک قوموں کی باگ ڈور باعزت، جرأت منداور علوم عمرانی کے حوالے سے گہری نظر و بصیرت رکھنے والے افراد کے ہاتھ میں نہ آ جائے تب تک وہ کوئی بڑا کردار ادا کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

گزشتہ سالوں میں یاران نکتہ داں کے لیے جس صدائے عام کا روسی سائنس دانوں نے اعلان کیا تھا اس سے ہر خاص و عام آگاہ ہے۔ یہ بے چارے سائنسدان روزی کی خاطر اپنے بکاؤ مال ہونے کا اعلان کرتے پھر رہے ہیں ۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

اگر برصغیر کے مسلمانوں کی موجودہ تاریخ پر نگاہ دوڑائی جائے تو ہمیں تین ایسی شخصیات ملتی ہیں جنہوں نے فکر و کردار کے حوالے سے مسلمانوں کو بیدار بھی کیا اور متحرک بھی۔ یہ تین ہستیاں سرسیدؒ، علامہ اقبالؒ اور سید مودودیؒ کی ہیں۔ اب اسے خوبیٔ قسمت کہیں یا شومیٔ قسمت کہ ان میں سے کوئی بھی سائنسدان کی کوششوں کا مرہون منت نہیں ہے۔ ویسے ہماری طرف سے کھلی اجازت ہے کہ یار لوگ چاہیں تو انہیں بھی کھینچ تان کے سائنس دان قرار دے دیں۔

پاکستان کی قومی تاریخ میں ڈاکٹر عبدالقدیر خاں بلاشبہ ایک عظیم نام ہے اور عظمت ان کے پاؤں چھوکر گزر رہی ہے لیکن پاکستان کو ایٹمی قوت کے عظیم وسر بلند مقام تک پہنچا دینے میں ڈاکٹر عبدالقدیر خاں سے بڑا کردار شاید پاکستان کے مرحوم وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کا تھا کہ جن کی زندگی، شخصیت اور کردار ہزار ہا الزامات سے لتھڑا ہوا ہے لیکن لیبارٹریوں کا قیام، فنڈز کی فراہمی، افراد کی دستیابی اور پرسکون ماحول مزید برآں بھرپور تحفظ، یہ سب عبدالقدیر خاں کے بس کی بات نہ تھی، یہ اس مدبر کے بس کی بات تھی جو بہرحال سائنس دان نہ تھا۔ ضیاء الحق مرحوم نے قدیر خاں کے اس پراجیکٹ کی حفاظت کے لیے جاں کی قربانی دے ڈالی لیکن یہ حفاظتی چھتری قائم رکھنا ایک سیاست دان اور مدبر کا ہی کام تھا، سائنس دان کے بس کا نہ تھا۔ نواز شریف اور بے نظیر بقول شخصے طوعاً وکرھاً ایٹمی پروگرام کی حفاظت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ فوج کے ڈر سے ہی سہی لیکن اگر سیاسی حکومتیں اور انتظامی مشینری پیچھے ہٹ جاتی اور قوم کی قوت، وہ قوم جو بہرحال سائنس دانوں پر مشتمل نہیں ہے، پروگرام کی اس حفاظت پر مامور نہ ہوتی تو ڈاکٹر عبدالقدیر خان، ان کی قابل قدر ٹیم اور ان کی تین دہائیوں کی محنت ہمارے کسی کام نہ آسکتی تھی۔ فی الاصل ایک سائنس دان کو آرٹس والوں کی چھتری حاصل ہوتی ہے۔

بلاشبہ مسلمانوں کو ایک بڑے طویل عرصے تک سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں دنیا کی امامت کرنے کا اعزاز حاصل رہا ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی مغرب کے زیر سایہ جس طرح پرورش پارہی ہے اس کی بنیادیں بھی مسلم سائنس دانوں کے عروج کے دور میں پائی جاتی ہیں۔ اس عروج کی کہانی کچھ اس طرح ہے کہ اللہ کے آخری نبی ﷺ نے قرآنی ہدایت کے عین مطابق علوم عمرانی کی اصلاح کے ذریعے ایک مضبوط نظریاتی گروہ کی بنیادیں رکھیں اور یہ گروہ نبی کریم ﷺ کی حیات مبارکہ ہی میں ریاستی ڈھانچہ کو اللہ کی عطا کردہ ہدایت کی روشنی میں صحیح رُخ میں قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے بعد اس ریاست نے اپنے اردگرد کی ریاستوں میں علوم عمرانی کی اصلاح کے حوالے معاشرہ کو مختلف بندھنوں سے آزاد کرنے کی جدوجہد کی اور اس سلسلے میں ضروری حد تک طاقت کے استعمال سے بھی دریغ نہ کیا، دنیا کے خاصے بڑے خطے پر معاشرتی حوالے سے جیسے جیسے زندگی پرسکون ہوتی گئی اور انتظام وانصرام مسلمانوں کے ہاتھوں میں چلا گیا اور اسلامی ریاست کا ادارہ اپنی دوسری ترجیح سائنس وٹیکنالوجی کے فروغ کی طرف متوجہ ہوا اور ٹھیک یہی وقت تھا جب اس طرح کا کام کرنا ممکن تھا۔

جب ریاستی ڈھانچے درہم برہم ہوں، معاشرہ سکون ناآشنا ہو، امن وانصاف ناپید ہوجائے تو ایسے حبس اور گھٹن کے ماحول میں تخلیقی، تحقیقی اور اکتشافی نوعیت کا کام کیونکر ہوسکتا ہے؟

موجودہ حالات میں جب ہم بحیثیت قوم ہر طرح کی یکجہتی و یکسوئی سے محروم ہوتے جارہے ہیں قوم کے ذہین ترین اور سارے کے سارے اعلیٰ دماغوں کو سائنس وٹیکنالوجی ایسی ثانوی چیز کے اندر کھپا دینا خطرناک نتائج سامنے لا رہا ہے۔ اندریں حالات قوم کی بہتری و ترقی کے لیے ایک امر لازم ہے کہ علوم عمرانی کی زبردست اہمیت کے پیش نظر ذہین اور محنتی طلبا کی ایک بڑی تعداد علوم عمرانی یعنی آرٹس کے مضامین میں مہارت تامہ حاصل کرے تاکہ سب سے پہلے تو قوم کو ایک رُخ دیا جاسکے۔ اوّلین چیز قوم کی یکسوئی، یکجہتی اور اس کے لیے کسی منزل کا متعین ہونا ہے اور یہ کام علوم عمرانی کے ذریعے ممکن ہے۔

جس طرح کے حالات اسکولوں اور کالجوں میں موجود ہیں ان میں سائنس کی تدریس و تعلیم کا کام کن بنیادوں پر ہوسکتا ہے؟ تجربہ گاہیں ضروری سامان سے خالی ہیں، اساتذہ ٹیوشن کی دکانوں میں تبدیل ہوگئے ہیں اور غنڈہ عناصر نے کام کرنے والے اساتذہ کا ناطقہ ویسے ہی بند کر رکھا ہے۔ معاشرتی ناہمواریوں اور معاشی ناانصافیوں نے حساس ذہنوں کا سکون ویسے ہی غارت کر رکھا ہے ایسے میں کسی ثمر آور سائنسی تعلیم کا تصور خاصا محال لگتا ہے۔ پھر سائنسی تعلیم کی بھیڑ چال کے باعث بہت سارے طلباء کو اس بھٹی میں محض رائے عامہ کے جبر کی وجہ سے سلگنا پڑتا ہے۔ اپنی خواہشات کے برعکس محض والدین کے دباؤ اور خواہش کے پیش نظر سائنسی مضامین پڑھنا شروع کرتے ہیں اور حالات کے ہاتھوں مجبور ہوکر ناکامیوں کا سامنا کرتے ہیں۔ کسی دردمند ادارے کو اس چیز کا سروے ضرور کرنا چاہیے کہ کلاس نہم میں سائنسی علوم میں داخلہ لینے والے طلباء کی تعداد کا کتنا فیصد ایف ایس سی کرنے کے بعد اعلیٰ سائنسی علوم کے میرٹ پر پورا اتر سکتا ہے؟ ان چار سالوں کی محنت کے ضیاع کا ذمہ دار کون ہے؟ ان ناکام ہوجانے والے طلبہ کی اتنی بڑی تعداد جن نفسیاتی، ذہنی، مالی، معاشرتی اور روحانی مسائل کا شکار محض ان ناکامیوں سے ہوتی ہے اس سب کو کس کھاتے میں ڈالا جائے؟

اس چیز کا بھی سروے کرنے کی ضرورت ہے کہ گریجوایٹ اور پوسٹ گریجوایٹ تک پہنچنے والے طلبا کی تعداد کا کتنا فی صد سائنسی تعلیم کی بھٹی سے جھلس کر اس فیلڈ میں آ نکلتا ہے اور یہ بھی معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ کتنے ہی طلبہ سائنسی علوم میں ناکامی کے باعث تعلیم کو خیرباد کہہ گئے۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اگر ہم غور کریں تو خاصی بڑی تعداد تو ایسے لوگوں کی نکل آئے گی، جو سائنسی علوم میں مسلسل ناکام ہورہے تھے اور ان ناکامیوں سے تنگ آ کر آرٹس گروپ میں آ پہنچے اور خاصے بڑے تعلیمی معرکے سرانجام دیئے۔ اگر ان کے تعلیمی کیریئر پر ناکامی کے یہ داغ نہ ہوتے تو یہ کتنے بڑے مزید علمی کارنامے سرانجام دے سکتے تھے۔

اگر چہ بعض لوگ سازش کے لفظ سے الرجک ہیں لیکن جس وسیع پیمانے پر ایک بے معنی انداز میں قوم کے ذہین طبقے کو سائنسی علوم کی بھٹی میں دھکیلا جا رہا ہے، یہ کسی قسم کی کوئی لمبی اور گہری سازش تو نہیں ہے؟ یہ سوچنا شاید سائنس دانوں کا کام نہیں ہے علوم عمرانی کے ماہرین کے ذمے ہے۔

جو کچھ سائنسی تعلیم ملک میں رائج ہے وہ بھی کسی بلند تر مقصد کے تابع نہیں ہے۔ سائنس کے طالب علموں کی ایک بھاری اکثریت کا خواب میرٹ پر پورا اتر کر میڈیکل کالج، انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ کا ہوتا ہے اور اس کی تعبیر کار، کوٹھی، سٹیٹس، چمک دمک اور بینک بیلنس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس لیے موجودہ سائنسی تعلیمی کی ہم امویوں اور عباسیوں کے دور میں ہونے والی سائنسی تحقیقات و ترقیات سے کوئی نسبت قائم نہیں کر سکتے۔

پاکستان کو اس وقت مغرب کے سیاسی اور اقتصادی تسلط کا سامنا ہے۔ اس میں بھی علوم عمرانی میں ہماری پسماندگی کو دخل حاصل ہے۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ دنیا کی قیادت سائنس کے ہاتھوں میں نہیں، ماہرین علوم عمرانی کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ اس عہد میں اسلامی تحریک کے لیے یہی سب سے بڑا چیلنج ہے کہ وہ اپنے معاشروں کو سمجھ کر اور منظم کر کے ایک مضبوط سیاسی اور اقتصادی قوت میں ڈھال دیں تا کہ ہم مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں۔ یہ بہت بڑا کام، بلکہ سب سے بڑا کام علوم عمرانی سے تعلق رکھتا ہے۔ فکری آزادی سیاسی تسلط اور اقتصادی برتری ختم کر سکتی ہے۔ اس کے بعد ہی وہ موقع آئے گا جب ہم پورے توازن اور یکسوئی سے اپنے جوانوں کو سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں آگے بڑھا سکیں گے اور مسلمانوں کے سائنسی علوم میں عروج کے اس عہد قدیم کی بلاشبہ یادیں تازہ ہو جائیں گی۔ ہر کام کا اپنا دائرہ کار ہے لیکن گھوڑا آگے ہوتا ہے اور تانگہ پیچھے ہوتا ہے تبھی سفر ممکن ہے۔

وقت کا تقاضا ہے کہ اسلامی بیداری کی تحریکیں، ادارے اور تنظیمیں ذہین طلبہ کی ایک بڑی تعداد کو علوم عمرانی کی طرف متوجہ کریں تا کہ وقت کے چیلنج کا صحیح جواب دیا جا سکے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کی اپنی اہمیت ہے اس سے انکار حماقت ہے لیکن اسے اپنے مقام پر ہی رکھنا ضروری ہے۔

اختتامیے میں ایک دلچسپ بات پیش نظر ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے وزیر اپنی وزارت کے مقاصد پورے کرنے کے لیے جو سرگرمیاں سرانجام دیتے ہیں۔ ان سرگرمیوں کا تعلق سائنس کے علوم سے ہوتا ہے یا علوم عمرانی سے؟

اثر کرے نہ کرے سن تو لے میری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

تعلیم و تربیت　　عبدالرشید ارشد ☆

ہمارے گھر اور تعلیمی ادارے ۔ لارڈ میکالے کے خواب کی تعبیر

متحدہ ہندوستان کی سرزمین پر جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے پرچم تلے انگریز بہادر نے قدم رکھا تو سب سے پہلے ہندوستان کے سماجی ومعاشرتی روّیوں کا جائزہ لینا ضروری سمجھا کہ اُن کے مستقبل کے منصوبوں کی تکمیل کے لیے یہ جائزہ بنیادی اہمیت کا حامل تھا۔ سماجی ومعاشرتی روّیوں کو بنیاد فراہم کرنے میں علم کی اپنی اہمیت ہے اور اس وقت علم دینی مدارس کے ذریعے اپنا کردار ادا کر رہا تھا۔ جائزے کے مطابق اس علم کے ہوتے ہوئے جن اقدار کی آبیاری ہو رہی تھی ان کی موجودگی میں کسی بھی 'انگریزی منصوبے' کی دال گلنا ناممکن تھا لہٰذا ضرورت محسوس کی گئی کہ 'متبادل روشن خیال علم' کا تحفہ ہندوستان کو دیا جائے جو ایسے افراد تیار کرے کہ سلطنت برطانیہ کا سورج یہاں چمکتا رہے۔

لارڈ میکالے نے برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستان کے سماجی، معاشرتی اَور علمی ماحول کا تجزیہ پیش کرنے کے بعد مستقبل کے لیے برطانوی حکومت کی تعلیمی پالیسی کے خدوخال بھی پیش کیے چنانچہ ہندوستان میں دینی مدارس کو 'چھیڑے' بغیر جدید تعلیمی ادارے متعارف کرائے گئے۔ سب سے پہلا کالج کلکتہ میں شروع ہوا۔ پھر مسلمانوں میں بھی جدید تعلیم کا شوق پیدا ہوا تو علی گڑھ میں انگریزی دَر آئی۔ بعد کے ادوار میں ملک کے اندر انگریزی تعلیم کے لیے سکولوں اور کالجوں کا جال پھیل گیا اور نئے انداز کی نسل تیار ہونے لگی جس سے برطانوی راج دن بدن ہندوستان میں مستحکم ہوا کہ انگریزی دان ملازمین بھارتی مفادات سے زیادہ برطانوی مفادات کے امین ثابت ہونے لگے، حکومت کو یہی مطلوب تھا۔

ولایت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ولایتی تہذیب وتمدن میں عملاً کئی سال گذار کر وطن واپس آنے والے بیرسٹر محمد علی جناح نے جب مکمل شعور وآگہی کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت زار کا مطالعہ ومشاہدہ کیا تو انہوں نے آزاد اسلامی مملکت کے لیے سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا۔ ہندوستان میں ہندو کی انگریز کے ساتھ ملی بھگت اور بظاہر کانگرس کی آزادی کے لیے تگ ودو کا بھی بنظرِ غائر مشاہدہ کیا۔ ہندو کی منافقت سے الگ رہتے مسلم لیگ کے پرچم تلے آزاد پاکستان کے لیے میدانِ عمل میں کود ے تو پیش نظر خالص اسلامی ریاست تھی جس کا دستور قرآن وسنت پر مبنی ہو۔

> 'ایک آزاد اسلامی سلطنت کے بغیر اسلام کا تصور ہی باطل ہے۔ مسلمان کے نزدیک صحیح آزادی کا تصور یہ ہے کہ ایسی اسلامی حکومت کو معرضِ وجود میں لائے جو

☆ النور ٹرسٹ جوہر آباد (خوشاب)

قرآنِ کریم کے ضابطہ خداوندی کی متشکل ہو......مسلمان کے نزدیک ہر وہ نظام باطل ہے جو کسی انسان کا وضع کردہ ہو کیونکہ اس کے پاس ایک محکم دستور (قرآن) ہے جو اس کی ہر موقع پر اور ہر زمانے میں راہنمائی کر سکتا ہے۔'

(حیات قائد اعظم، صفحہ ۲۵۲، چوہدری سردار محمد عزیز)

آئین میں بڑی تگ و دو کے بعد اور پھر ۳۱ علما کے ۲۲ نکات کو قرار دادِ مقاصد کی صورت میں اسلامی تعلیمات کو سمونے کی کوشش کی گئی مگر یہ ساری محنت آئین کی کتاب سے نکل کر عملی زندگی کے کسی بھی پہلو کو سنوارنے کے لیے استعمال نہ ہو سکی۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا نظامِ معیشت بدستور سُود پر استوار رہا تو نظامِ تعلیم بھی لارڈ میکالے کی سوچ اور محنت کا ہم نوا رہا۔ کسی حکمران نے نظامِ تعلیم کا قبلہ درست کرنے کی کوشش نہ کی۔ ماضی کے ۶۵ سالوں میں ہر حکمران نے اسلامی نظامِ تعلیم کی پیٹھ میں خنجر گھونپنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ نصابِ تعلیم سے چن چن کر اسلامی خدوخال کے 'کانٹے' نکالے گئے۔ کسی بھی احتجاج کو خاطر میں نہ لایا گیا کہ 'حقیقی ولیٔ نعمت' امریکہ و یورپ یا قرض دینے والا IMF ایسا نہ چاہتے تھے۔

نصابِ تعلیم کا حلیہ بگاڑ کر اسے اسلام سے دور کرنے میں حکومتی کردار کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے!

لیول انگلش کے ایک سبق کا ترجمہ: (ایک اقتباس)

'چھوڑتے ہوئے گھر دفعتاً اس کا تصور یوں ابھرا جیسے ابھی ابھی وہ انہیں چھوڑ کر نکلے ہیں۔ کاش وہ میرے ساتھ سوار ہو جاتی۔ نہ جانے اب وہ کن پانیوں میں گھری ہوگی۔ وہ کون تھی جو زینے سے اترتے ہوئے سیڑھیوں کے پیچھے مجھ سے ٹکرا جاتی تھی۔ سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ وہ ہرنی جیسی آنکھوں والی اپنے لبادے میں دو پکے پھل لیے پھرتی تھی اور جب سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے اس نے اُنہیں تھاما تو یوں لگا کہ دو گرم دھڑکتے ہوئے پوٹے والی کبوتریاں اس کی مٹھیوں میں آ گئی ہیں۔'

(آکسفورڈ پرنٹنگ پریس سے طبع کتاب) (بحوالہ قرطاس ابیض، تنظیم اساتذہ پنجاب)

☆ ساتویں جماعت کے طلبہ و طالبات کی سائنس صفحہ ۳۱ پر Reproductive of Man

"A Sexual production. There are various. methods of sexual production in different organism" (بحوالہ مذکورہ صفحہ ۷)

کلاس میں معلّم یا معلّمہ معصوم ذہنوں کے سامنے مذکورہ طرز کے اسباق کی وضاحت کس طرح کرتے ہوں گے یا بچے بچیاں گھر میں والدین یا بہن بھائیوں سے سبق کی وضاحت پوچھیں تو یہ کیسے

محسوس ہوگا؟ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ آکسفورڈ اور دوسرے اداروں سے پیچھے نہیں رہا۔ مذکورہ قرطاسِ ابیض میں ٹھوس شہادتیں موجود ہیں کہ نصاب سے اسلام کو کیسے خارج کیا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ مسلمان ملک کے مسلمان کہلانے والے ماہرین تعلیم نے یہ راہ کیوں اپنائی؟ کیا یہ ان کی اپنی سوچ ہے یا اس سوچ اور ان فیصلوں کے پیچھے کوئی دوسری خارجی قوت ہے جو ہر قیمت پر پاکستان کے نصاب تعلیم سے اسلام کو خارج کروانے پر ادھار کھائے بیٹھی ہے؟ ان سوالوں کا نکھرا ہوا جواب بھی ہمارے سامنے ہے اور اس کے باوجود ہماری آنکھیں بند رہیں تو حُب الوطنی اور اسلام دوستی کے ماتم کے سوا چارہ کیا ہے۔ 'محسنین' کا چہرہ ان اقتباسات میں ملاحظہ فرمایئے:

☆ پاکستان سمیت تمام مسلم ممالک کے دینی مدارس اور سکولز بنیاد پرستوں اور دہشت گردوں کی آماج گاہ ہیں اور ہمیں ان کے متعلق تشویش ہے اس کے ازالے کے لیے ہم جنرل پرویز مشرف سمیت دیگر ممالک کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں۔' (امریکی وزیر خارجہ کولن پاول بحوالہ'نوائے وقت'لاہور)

☆ جنرل پرویز مشرف دینی مدارس اور سکولز میں جو اصطلاحات متعارف کروا رہے ہیں ہم ان کا خیر مقدم کرتے ہیں'۔ (پشاور یونیورسٹی میں برطانوی وزیر خارجہ جیک سٹرا کا خطاب، بحوالہ قرطاسِ ابیض تنظیم اساتذہ)

☆ ایک امریکی ادارے'ایجوکیشن سیکٹر ریفارمز (ایسٹر) کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر مسٹر برائن نے اسلام آباد میں بتایا کہ نصاب کی اَپ گریڈیشن کے لیے امریکہ پاکستان کو ۶۰ ملین ڈالر دے گا' (روزنامہ خبریں لاہور)

☆ 'امریکہ کے خلاف پاکستان میں بڑھتی ہوئی نفرت کے علاج کے لیے وہاں کی ونڈرفل لیڈی محترمہ زبیدہ جلال وفاقی وزیر تعلیم پاکستان نصابِ تعلیم میں تبدیلیاں کر کے اس کا علاج کر رہی ہیں۔' (نوائے وقت لاہور)

ہم نصاب میں چند 'روشن خیال تبدیلیاں اور ان تبدیلیوں کے ماسٹر مائنڈ حضرات سے آپ کو متعارف کروا چکے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تبدیلیاں کروانے والے حقیقی ماسٹر مائنڈ حضرات کو ہم نے خوامخواہ درمیان میں گھسیٹ لیا ہے۔ ہم بطور شہادت ان کے اعتراضات پیش کرتے ہیں:

☆ 'پاکستان اور بھارت کا نصاب مشترکہ ہونا چاہیے' (جنرل پرویز مشرف انٹرویو'انڈیا ٹوڈے' بحوالہ قرطاس ابیض)

☆ 'بیالوجی کی کتاب میں قرآنی آیات کا کیا کام؟ اور اگر سیرت سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے کتے کی تصویر آ گئی تو کیا مضائقہ' (زبیدہ جلال کا اسمبلی میں خطاب، بحوالہ قرطاس ابیض تنظیم اساتذہ)

☆ 'برین واشنگ کے لیے وفاقی تعلیمی اداروں سے دوسو اساتذہ کی امریکی روانگی'۔ 'میری تقرری

کہیں اور سے ہوئی ہے آپ مجھے نہیں ہٹا سکتے۔' (زبیدہ جلال کا لاہور میں خطاب، بحوالہ قرطاس ابیض)

مذکورہ تفصیل سرکاری سطح پر لارڈ میکالے کی ذریت کی تیاری کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ کس طرح کا نصابِ تعلیم کس اخلاق و کردار کی حامل نسل تیار کرنے میں نمایاں کردار ادا کررہا ہے۔ اب اسی تصویر کا دوسرا رُخ ملاحظہ فرمائیے کہ نئی نسل کے والدین مکمل شعور و آگہی کے ساتھ 'سرکاری سوچ' کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں۔ والدین کی اس محنت کے دو رخ ہیں، پہلا گھر کے اندر جہاں بچے بچی کو پیدائش کے بعد ابتدائی گفتگو میں مادری زبان سے دُور رکھتے انگریزی ان کے قلب و ذہن میں اتارنے کی کوشش کرتے دیکھے جاتے ہیں۔ روشن خیال والد اور والدہ کبھی بچے کو ''ایپل'' کھلاتے ہیں تو کبھی 'بنانا' اور کبھی 'ہیڈ واش' کرواتے دیکھے جاتے ہیں۔ جس طرح لندن میں پاکستانی عورت بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی اور کہنے لگی کہ ڈاکٹر صاحب! نہ بچہ 'ایٹنا' ہے نہ ہی 'سلیپتا' ہے بس ''ویپتا' ہی 'ویپتا' ہے دوائی دے دیجیے۔

یہ روشن خیال کہلوانے کے لیے ہر لمحہ بے چین والدین کا اپنے بچوں کے 'بہتر مستقبل' کی خاطر روّیہ ہے اور دیکھا دیکھی یہ روّیہ وبا کی صورت اختیار کررہا ہے۔ گھر کی اس 'روشن خیال تربیت' میں استحکام و استمرار کی خاطر اولاد کو انگلش میڈیم کا بورڈ آویزاں کیے سکولوں میں بھاری بھرکم فیسوں کے باوجود، داخلہ دلایا جاتا ہے اور پھر بھاری بھرکم فیس ہی نہیں کتب، یونیفارم اور آئے دن کے نازنخروں کے اخراجات پورے کرنے کی خاطر اگر بعض ایماندار کولھو کے بیل کی طرح رات گئے تک مزدوری کرتے ہیں۔ دو دو، تین تین جگہ کام کرتے ہیں تو ''ایمان کے جھنجھٹ میں نہ الجھنے والے 'بالائی آمدنی' کے راستے پر چل نکلتے ہیں۔ آخرت کی فکر اگر کبھی قلب و ذہن پر دستک بھی دے تو 'بچوں کا مستقبل' کان دھرنے نہیں دیتا۔

روشن خیال تعلیم و تربیت کے ادارے بورڈ تو انگلش میڈیم کا لگا لیتے ہیں مگر آٹے میں نمک جتنے ادارے ہیں جہاں سٹاف رواں انگلش بول سکتا ہے ورنہ 'ہینڈ واش' کی طرح آدھا تیتر آدھا بٹیر دیکھنے میں آتا ہے محض انگریزی میں تحریر کتب پڑھا دینے کا نام انگلش میڈیا نہیں ہے بلکہ انگلش میڈیم تو یہ ہے کہ معلّم اور معلّمہ کلاس روم میں داخل ہونے سے لے کر کلاس چھوڑنے تک صرف انگلش ہی میں تمام گفتگو کرے اور شاگرد بھی انگلش ہی میں سوال کریں یا جواب پوچھیں۔ سروے کرلیجیے آپ کو کہیں بھی یہ معیار نہ ملے گا۔

روشن خیال نسل پیدا کرنے والوں نے جس نوع کا خوبصورت نصابِ تعلیم ترتیب دیا ہے اور اس میں لمحہ لمحہ جس ''تعمیری'' تبدیلی کے لیے کوشاں ہیں اس کی جھلکی ہم آغاز میں آپ کے سامنے رکھ چکے ہیں۔ کیا ایسے اقدامات، ایسے ماحول اور ایسے نصاب کے ساتھ قائداعظمؒ کے اسلامی جمہوریہ پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے؟ آج ہمارے کالجز اور یونیورسٹیوں سے جو نسل فارغ ہورہی ہے وہ امریکہ و یورپ کی خواہشات کی تکمیل تو بجا طور پر کہی جاسکتی ہے کہ لارڈ میکالے کی ذرّیت ہے مگر اسلام کے ساتھ وابستگی دیکھنے کو نہیں ملتی۔

میڈیا

ڈیوڈ کیمرون☆

انٹرنیٹ کی تباہ کاریاں

بچوں اور نوجوانوں کو اس مصیبت سے کیسے بچایا جائے؟

''میں انٹرنیٹ کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں، اس کے ان اثرات کے بارے میں، جو ہمارے بچوں کی معصومیت پر مرتب ہو رہے ہیں، کیسے آن لائن پورنوگرافی بچپن کو برباد کر رہی ہے اور کس طرح انٹرنیٹ کے تاریک کونوں میں ایسی اشیاء موجود ہیں، جو ہمارے بچوں کے لیے براہ راست خطرہ ہیں اور ضروری ہے کہ ان اشیاء کو ختم کیا جائے۔ میں یہ تقریر اس لیے نہیں کر رہا کہ میں اخلاقیات کا درس دے رہا ہوں یا میں خطرے کی گھنٹی بجانا چاہتا ہوں بلکہ میں انتہائی گہرائی کے ساتھ ایک سیاست دان اور ایک باپ کی حیثیت سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ عمل کا وقت آن پہنچا ہے۔ سادہ الفاظ میں بات یہ ہے کہ ہم کیسے اپنے بچوں اور ان کی معصومیت کی حفاظت کرتے ہیں۔''

''مجھے واضح طور پر ہر مجرمانہ ذہن کو یہ کہہ لینے دیں، جو اس کے برعکس سوچتا ہے۔ اب کوئی ایسی چیز نہیں، جس کو انٹرنیٹ پر محفوظ جگہ کا نام دیا جا سکے اور جہاں سے بچوں کے استحصال کا مواد نہ حاصل کیا جا سکے۔ انٹرنیٹ پر تلاش کی کچھ خطرناک اصطلاحات کو بلیک لسٹ کرنا ہوگا، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اصطلاح لکھنے کے بعد سرچ انجن کوئی نتیجہ ظاہر نہیں کریں گے۔''

''نئے قوانین کے مطابق، جو ویڈیوز برطانیہ میں آن لائن دیکھی جاتی ہیں، ان پر وہ پابندیاں عائد ہوں گی، جو دکانوں پر فروخت ہونے والی ویڈیوز پر ہوتی ہیں۔ سرچ انجنز اکتوبر۲۰۱۳ء تک غیر قانونی مواد کو بلاک کرنے کے لیے مزید اقدامات کریں گے۔ استحصال اطفال اور حفاظت کے آن لائن ادارے کے ماہرین کو مزید اختیارات دیئے جائیں گے تاکہ وہ خفیہ فائل شیئرنگ نیٹ ورکس کا جائزہ لے سکیں۔ تمام ملک سے پولیس کی جانب سے جمع کیے گئے بچوں کی ممنوعہ پورنوگرافی کے مناظر کا ایک محفوظ ڈیٹا بیس بنایا جائے گا۔ اس ڈیٹا بیس کو غیر قانونی مواد اور بچوں کی پورنوگرافی کے ناظرین کی نشاندہی کے لیے استعمال کیا جائے گا۔''

☆ وزیراعظم برطانیہ

البرہان

سوال یہ ہے کہ اگر وزیراعظم برطانیہ کو احساس ہو رہا ہے کہ انٹرنیٹ کے غلط استعمال سے بچوں اور نوجوانوں کے اخلاق بگڑ رہے ہیں، ان کی تربیت غلط ہو رہی ہے۔ اور اس کے لیے وہ متعدد اقدامات کرنا چاہ رہے ہیں۔ اس کے باوجود کہ ان کے ہاں اخلاقی اقدار کا تصور گہنا چکا ہے، ان کے ہاں عریانی اور فحاشی جرم نہیں، ان کے ہاں حیاء وعفت اور پردے کا کوئی تصور نہیں، تو پھر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وزیراعظم جناب میاں محمد نواز شریف صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے جو صوم وصلاۃ کے پابند ہیں، مشرقی اقدار کے دلدادہ ہیں اور اس مسلم لیگ کے سربراہ ہیں جس نے اسلام اور دوقومی نظریے کی بنیاد پر پاکستان بنایا تھا اور اسے اسلام کا قلعہ اور تجربہ گاہ بنانے کا اعلان کیا تھا، کہ انہیں اس بارے میں کتنا پریشان ہونا چاہیے لیکن ہم نے آج تک محترم وزیراعظم یا ان کے ساتھیوں میں سے کسی سے اس بارے میں ایک لفظ نہیں سنا کہ وہ قوم کے بچوں اور نوجوانوں کو میڈیا اور انٹرنیٹ کی تباہ کاریوں سے بچانا چاہتے ہیں اور اس کے لیے سنجیدہ اقدامات کرنا چاہتے ہیں۔ ہم وزیراعظم کے سٹاف اور ان کے ساتھیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ انہیں اس بارے میں بریف کریں اور میڈیا کی اصلاح کے لیے سنجیدہ اقدامات کیے جائیں۔

مولانا عبدالرؤف فاروقی ☆

مولانا زاہدالراشدی معاصرت کی زد میں

میں مولانا زاہدالراشدی کا وکیل صفائی نہیں ہوں بلکہ عادتاً میں کسی زندہ انسان کی تو کیا خود اپنی صفائی بھی پیش نہیں کیا کرتا، لیکن سوا ستیاناس ہو معاصرت اور اس کی چشمک کا کہ لوگ ان کے معائب کی تلاش میں ان کی خوبیوں اور احسانات کو بھی بھول گئے، عبدالحمید عدم نے کہا تھا ؎

عدمؔ احتیاط لازم ہے
لوگ منکر نکیر ہوتے ہیں

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے ایک موقع پر فرمایا:

''لوگ جب کسی سے محبت کرتے ہیں تو زمانے بھر کی تمام خوبیاں اس کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں لیکن اس کے مخالف ہوتے ہیں تو خود اس کی اپنی خوبیاں بھی اس سے چھین لیتے ہیں''۔

میں نے دیکھا کہ جب چاروں طرف سے ان پر تیر برسائے جا رہے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ

دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف
تو اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

ان پر الزامات کی طویل فہرست تیار کی گئی ہے اور باقاعدہ فرد جرم بھی عائد کر دی گئی، اب سزا سنانا باقی ہے اور وہ کسی ایک ''مفتی'' کی طرف سے ''فتویٰ'' کی صورت میں ہو گی اور لگتا ہے کہ اس کی تصویب و تائید میں مفتیان کرام کی ایک لائن لگ جائے گی کہ ہم نے چھ چھ ماہ اور ایک ایک سال کے تخصص کی صورت میں مفتیان کرام کی ایک بڑی کھیپ تیار کر رکھی ہے، جنہیں فتویٰ لکھنا بے شک نہ آئے، کسی فتویٰ کی تائید میں تائید کے اصطلاحی الفاظ لکھنے کی مہارت تو بہرحال حاصل ہے۔ جب مولانا راشدی پر نوازشات کی بارش اس طرح ہو چکی ہو کہ ان کی فرد جرم پر عالم برزخ سے حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت تھانویؒ اور حضرت نفیس الحسینیؒ جب کہ عالم دنیا سے مولانا سلیم اللہ خان اور مولانا تقی عثمانی جیسے اکابر کی تائید حاصل کر لی گئی ہو یا ان اکابر کے اسماء گرامی کا وزن اپنی رطب و یابس، بے وزن، بے ربط نوازش

☆ سیکرٹری جنرل جمعیۃ علماء اسلام (س) پاکستان

کے پلڑے میں ڈالنے اور کتاب فروشی کے لئے ان ناموں کو استعمال کرنے کی بیہودہ کوشش میں ان اکابر کی توہین کا ارتکاب بھی کر لیا گیا ہو اور جس طرح کسی کے قول

''تیلی رے تیلی تیرے سر پر کولہو''

میں وزن نہ ہونے کا کہا جائے تو وہ کہے کہ وزن درست ہو نہ ہو، تیلی پر بوجھ تو پڑے گا۔

بسیار نویسی اور کتاب فروشی کے فن پر تحسین بھی وصول کی جا چکی ہو اور کاروبار بھی کر لیا گیا ہو، تو میں نے سوچا مولانا زاہد الراشدی کے کچھ محاسن کا تذکرہ بھی کیا جائے اور قطع نظر اس کے کہ ان کی نسبی نسبت علم وعمل کے کس آفتاب ومہتاب سے ہے اور ان کے بیٹے کن راہوں کے مسافر ہیں اور قطع نظر اس کے بھی کہ وہ علوم نبوت کی کس درسگاہ میں کس درجہ کے مسند نشین اور مدرس ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ اگر ان پر نوازشات کا دائرہ صرف ان کے صاحبزادے کی نسبت سے ہی محدود رہتا تو شاید مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی لیکن اب تو ہمہ جہت تنقید کا بازار گرم کر دیا گیا اور شعلہ باری ہے، انہیں مودودیت نواز، مماتیت نواز، قادیانیت نواز، بریلویت نواز، غامدیت نواز اور نہ جانے کیا کیا نواز قرار دیا گیا ہے، کاش کہ ان کی مدارس نوازی، دیوبندیت نوازی، علم نوازی، دینی تنظیمات نوازی، مذہبی تحریکات نوازی، طلباء نوازی، احباب نوازی، طالبان افغانستان نوازی، جہاد ومجاہدین نوازی کے آئینے میں ان کا جائزہ لیا جاتا اور ان کی اس سلسلہ میں خدمات کا بھی اعتراف کیا جاتا۔

اللہ جانتا ہے کہ جب سے میں نے مولانا زاہد الراشدی کو قریب سے دیکھا ہے ان کے اندر سب کے لئے خیر اور اس سلسلہ میں انہیں فیاضی اور ایثار وقربانی کا پیکر پایا ہے۔

☆ وہ شاہ ولی اللہ کی فکر اور مولانا عبید اللہ سندھی کے فلسفہ کے ترجمان ہیں۔

☆ دیوبند اور دیوبندیت کے مناد، دیوبندی تحریکات، دیوبندی تعبیرات وتشریحات کے داعی اور اکابر علماء دیوبند کی عظمت وعفت کے وکیل صفائی ہیں۔

☆ انہوں نے دینی مدارس کے سالانہ اجتماعات میں دینی فکر اور مدارس کے نظام ونصاب اور طریق تربیت کی جس انداز سے ترجمانی کی اور علماء وطلباء کے ساتھ ساتھ عوام الناس کی جس طرح ذہنی و فکری تربیت کی، اس کی شہادت ملک کے چپے چپے پر چھوٹے بڑے ہزاروں مدارس کے در و دیوار سے لی جا سکتی ہے۔

☆ عام مسلمان کی فکر پر الحاد اور بے دینی کی یلغار نے جب ان گنت ذہنوں پر سکتہ طاری کر رکھا

تھا، مولانا راشدی کی آواز گونجتی رہی اور ملحدین دم بخود رہ کر رہ گئے۔

☆ ملک میں نفاذ شریعت کی جدوجہد میں جمعیۃ علماء اسلام میں رہتے ہوئے بھی اور اس سے الگ ہو کر بھی پاکستان شریعت کونسل کے پلیٹ فارم سے بھی بلا شبہ ہزاروں صفحات پر مشتمل قرار دادیں، مطالبات اور مضامین ان کے قلم سے اور ان کی صلاحیت سے لکھے گئے اور اگر کوئی حقیقت کا اعتراف کرنے والا ہو تو یہ ایک بہت بڑا دینی سرمایہ ہے جس سے آئندہ بھی فائدہ اٹھایا جاتا رہے گا۔

☆ تحریک آزادی ہند اور پھر تحریک پاکستان میں علماء دیوبند کے مؤقف کے حق میں دینی مدارس کے طلباء کی ذہن سازی کے لئے ہزاروں تقریروں کا اگر مجموعہ تیار ہو تو نقاد ذہن کے ہوش وحواس اڑ جائیں اور انہیں اپنے لفظوں اور جذبوں پر شرمندگی ہو۔

☆ مولانا راشدی، نام نہاد بین الاقوامی برادری کے مقابلہ میں ہمیشہ اسلام کے نمائندے بن کر کھڑے نظر آتے ہیں اور جہاں اتحاد امت کے داعی کی حیثیت سے اہل سنت وجماعت کے تمام مکاتیب فکر کے درمیان رواداری کے علمبردار ہیں وہاں ان تمام مکاتیب فکر کے سامنے وہ علماء دیوبند کے نمائندہ کی حیثیت سے بیٹھتے رہے اور کسی معاملے میں بھی کبھی وہ دیوبندی ہونے میں مداہنت کا شکار نہیں ہوئے۔

☆ انہوں نے ملک میں دینی تنظیمات اور مدارس کے اجلاسوں میں شرکت کے لئے لاکھوں میل کے ہزاروں سفر کئے ہیں اور اس سلسلہ میں ایک درویش صفت، ایثار وقربانی اور تحمل و برداشت کے پیکر کا کردار ادا کیا، نہ سفر کی سہولت کا مطالبہ، نہ کھانے اور آرام کے لئے شرائط اور نہ وقت مانگنے والوں کے لئے غلط بیانی اور انکار کی عادت، کیا ہر کسی نے انہیں آزمایا نہیں یا سب نے ان کی ان سب مہربانیوں اور قربانیوں سے آنکھیں بند کر کے ان پر پتھر برسانے والوں میں شامل ہونے کو جہاد سمجھ لیا ہے۔ میں ہمیشہ ان کی تبلیغ کے سلسلہ میں جفاکشی پر حیران ہوتا ہوں کہ رات اور دن، کار، بس، ویگن اور چنگ چی، شہروں، قصبوں، دیہات اور ڈیروں اور اس طرح کے تمام پہلوؤں سے بے نیاز، ہمہ وقت، ہمہ تن اور ہمہ جہت، جدوجہد، اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی اور مشن کے ساتھ لگن نہیں تو کیا ہے؟

افغان جہاد میں شرکت، طالبان کی حمایت اور جہادی تنظیموں کی سرپرستی، وہ کونسا محاذ ہے جس پر وہ قلم بردار سرگرم عمل نظر نہیں آئے، اور گزشتہ تیس برسوں میں جمعیت علماء اسلام، وفاق المدارس العربیہ، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت، مجلس احرار اسلام، جامعۃ الرشید اور بڑی چھوٹی تنظیموں کی وہ کون سی جدوجہد ہے جسے ترتیب دینے میں ان کی مشاورت شامل نہ ہو، پھر بھی ان کے خلاف محاذ گرم کیا گیا تو میں اسے محسن کشی کا نام تو دے سکتا ہوں، سازش اور منصوبہ بندی قرار نہیں دے سکتا کہ اس کے لئے میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔

البتہ ایسا ہوتا آیا ہے کہ جس شخصیت کی اثر پذیری، بے ٹوک موقف اور اذہان وافکار کی آبیاری عام

ہو اسے کوئی نہ کوئی شیطانی قوت ،متنازعہ بنانے کے لئے منصوبہ بندی کرتی آئی ہے۔ ہندوستان میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ،شاہ اسمٰعیل شہیدؒ،مولانا رشید احمد گنگوہیؒ،مولانا اشرف علی تھانویؒ،مولانا خلیل احمدؒ سہارنپوری اور دیگر علماء دیوبند کے خلاف احمد رضا خان کا فتویٰ اسی طرح کی ایک سازش تھی کہ جن لوگوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو استعمار اور اس کے گماشتوں کی الحادی چالوں سے محفوظ رکھنے کی محنت کی انہیں متنازع بنا دیا گیا۔ اس طرح کے واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے، کچھ منصوبہ ساز ہوتے ہیں، کچھ منصوبہ ساز قوت کے وظیفہ خوار اور بہت سے مخلص، نادان دوست!

مصلح اور مبلغ کو ذہنی افکار کی ٹکٹکی پر باندھ دیا جاتا اور لفظوں کی سنگ باری کے لئے طبل بجایا جاتا ہے۔اور ہر کس و نا کس ثواب آخرت کی خواہش پر الفاظ کے پتھروں سے جھولی بھر کے گزرتا ہے اور ٹکٹکی پر بندھے عظیم انسان کو اس کے ناکردہ گناہوں کی سزا کے طور پر نشانہ لگاتے ہوئے جھولی خالی کر کے آگے بڑھ جاتا ہے اور نہیں سوچتا کہ کس شخصیت ، کس فکر، کس دانش، کس علم ، کس عظمت، کس شرافت، کس دیانت، کس خیر خواہی اور کس جدوجہد کو زخم لگانے اور اس کا خون بہانے میں شریک ہو کر آ رہا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مولانا زاہد الراشدی کے ساتھ ایسا ہی کچھ ہو رہا ہے، میں ان پر لفظوں کے تیر چلانے والوں کو چند لمحوں کے لئے سوچنے کی دعوت پر اپنی تحریر ختم کرتا ہوں کہ آپ کے پاس اس طرح کے بےلوث، بےطلب اور انتھک افراد کتنے ہیں کہ مولانا کو اپنے مسلکی جسم سے کاٹ کر الگ کر دینے کے بعد ان کے ذریعہ وہ خلا پر کر سکو گے جو مولانا راشدی کے سیاسی اور تحریکی قتل کے بعد پیدا ہوگا؟

اور درخواست کروں گا کہ انصاف اور اخلاقیات کی بھی ایک دنیا ہے اور شخصی احترام کا بھی ایک دائرہ ہوتا ہے، خدارا اس کا لحاظ رکھا جائے،اس سے دین اور مسلک کا ضرور فائدہ ہوگا۔

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقل خداداد

اے مرد خدا! تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

اسلامی تحریکیں

محمد رشید ☆

غلبۂ دین کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ

چودھری محمد یوسف صاحب ایڈووکیٹ نے ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ (شمارہ ستمبر ۲۰۱۳ء) میں ''میری تحریکی یادداشتیں'' نامی کتاب پر تنقیدی تبصرہ کیا ہے۔ اسے پڑھ کر دل و دماغ دکھ، افسوس اور فرسٹریشن کے ایک عجیب اور نہ ختم ہونے والے احساس سے بھر گئے۔ پاکستان کی دینی جماعتوں کی ناکامی کا بنیادی سبب دل و دماغ کی سکرین پر چلتا رہا اور اذیت سے دوچار کرتا رہا۔ ہم پوری دیانتداری سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستان کی دینی جماعتوں کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب خود ان کے اندر موجود ہے، لیکن افسوس وہ اسے باہر تلاش کرتی پھرتی ہیں۔ ہماری دینی جماعتوں کی ناکامی کی سب سے بڑی اور بنیادی وجہ ان کے قول و فعل کا تضاد ہے۔

دوسرے لفظوں میں ہماری یہ محترم جماعتیں جس عدل و قسط کو سارے ملک اور ساری دنیا پہ نافذ کرنے کی علمبردار ہیں، افسوس صد افسوس وہ اس عدل و قسط کو اپنی نہایت محدود جماعتی سطح پر نافذ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ وہ بنیادی کمزوری ہے جس کی پاداش میں پاکستان کی دینی جماعتیں بدترین ناکامی سے دوچار ہیں اور گزشتہ ۶۶ سال سے تلاش منزل کے لیے بھٹک رہی ہیں۔ ہماری رائے میں ان جماعتوں کا یہ وہ نقص ہے جس نے نہ صرف پاکستان میں نفاذ اسلام کی راہ کو کھوٹا کیا ہوا ہے بلکہ اسی کی وجہ سے قدرت نے ''اطمینان قلب اور روحانی سرور'' کی عظیم ترین دولت کے معاملہ میں انہیں قلاش اور مفلس کر کے رکھ دیا ہے۔ سارے ملک اور سارے جہاں پر عدل و قسط اور نظام عدل اجتماعی قائم کرنے کے دعووں کے باوجود ہماری یہ جماعتیں (ان جماعتوں کے ذمہ دار) اپنے اندرونی معاملات اور اپنے باہمی اختلافات و نزاعات میں عدل و قسط سے راہ فرار اختیار کرتے ہیں اور جبر، جھوٹ اور دباؤ جیسے ہتھکنڈے استعمال کرنے کے بعد وہی طرز عمل اختیار کرتے ہیں جو یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اختیار کیا تھا یعنی اپنی ذات یا ذاتی اغراض کی تسکین کے لیے ظلم، دھوکہ اور جھوٹ کا ارتکاب کرنا اور بعد میں نیکوکار بن جانے کی اداکاری کرنا۔ کیا یوسف علیہ السلام کے احسن القصص میں ہماری دینی جماعتوں (کے ذمہ داروں) کے لیے کوئی سبق اور کوئی نصیحت نہیں؟

☆ (abu_munzir1999@yahoo.com)

صاحبو! معاف کیجئے گا ہمارا یہ تلخ مگر حقیقت پسندانہ تبصرہ پاکستان کی ان دینی جماعتوں (کے ذمہ داروں) کے بارے میں ہے جنہیں ہم پسند کرتے ہیں، جو ہمارے خیال میں قرآن وسنت کے زیادہ قریب رہ کر دعوت واقامت دین کا کام کرنے کے داعی ہیں، یا دوسرے لفظوں میں جن میں بگاڑ کا لیول باقی دینی جماعتوں کے مقابلہ میں کم ہے۔عدل وقسط کے بیج کو اپنی محدود جماعتی سطح پر ہی کچل دینے کا اولین اظہار ہماری دینی جماعتیں اس طرح کرتی ہیں کہ ''خود احتسابی'' اور اس کے حق میں اٹھنے والی ہر آواز کو اپنی محدود جماعتی سطح پر ہی خاموش کرا دیتی ہیں۔اور خود احتسابی کے ماحول کو پنپنے اور پھلنے پھولنے نہیں دیتیں۔ہم پورے خلوص اور دردمندی سے اس حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں کہ جس عدل اجتماعی اور نظام عدل وقسط کو ہماری یہ محترم جماعتیں پورے ملک اور پورے عالم پر غالب و نافذ کرنے کی داعی وعلمبردار ہیں، اپنی محدود جماعتی سطح پر اسی ''عدل وقسط'' کے ننھے پودے کو مسلسل کچلتی اور برباد کرتی رہتی ہیں۔ان جماعتوں میں مخلص افراد کے اخلاص ومعصومیت کا بے دریغ قتل کیا جاتا ہے۔ہم حیرت اور تاسف کے نہ ختم ہونے والے احساس میں ڈوب جاتے ہیں جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ جس اقامت دین اور نظام عدل وقسط کا پورا درخت ملک کے وسیع وعریض رقبے پر گاڑھ دینے کے شوق میں ہماری یہ محترم جماعتیں جنون کی حد تک مبتلا ہیں، اسی نظام عدل وقسط کے ننھے منے پودوں کو ہر روز یہ اپنی محدود جماعتی سطح پر نہایت بے حسی سے روندتی چلی جا رہی ہیں۔

افراد ہو یا جماعتیں خود احتسابی کے بغیر ترقی اور روحانی ترفع ناممکن ہے مگر خود احتسابی کے لیے تو ایک نہایت بیدار اور طاقتور ضمیر کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ جماعتوں اور معاشروں کا ضمیر وہ صالح افراد ہوا کرتے ہیں جو جماعتوں اور معاشروں کے قول وفعل کے تضادات اور انحرافات کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں اور اس کی اصلاح کے لیے قول حق کا فریضہ پوری دیانتداری سے ادا کرتے ہیں۔خوش نصیب ہیں وہ معاشرے اور وہ جماعتیں جو اپنے ضمیر (قول حق کا فریضہ ادا کرنے والے اصحاب خیر اور جماعتوں کے بگاڑ سے لڑنے والے اصحاب عزیمت) کا گلا گھونٹنے سے نہ صرف اجتناب برتتے ہیں بلکہ اس ''مبارک ضمیر'' کو، بگاڑ کے آگے بند باندھنے اور اصلاح کی راہ ہموار کرنے کے لیے، اپنا فریضہ ادا کرنے کی مکمل آزادی عطا کرتے ہیں۔اور خوش نصیبی سے محروم ہیں وہ معاشرے اور جماعتیں جو اس ''ضمیر'' کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتی ہیں، اپنے تضادات اور انحرافات کو منطق کے زور پر منوانے کی کوشش کرتی ہیں اور اصلاح کی ہر آواز کو اجنبی جان کر اسے ''شہر بدر'' یا کم از کم ''جماعت بدر'' کرنا اپنا حق سمجھتی ہیں۔

ہم نہایت کرب اور اذیت سے اپنے آپ کو یہ عرض کرنے پر مجبور پاتے ہیں کہ پاکستانی معاشرہ اور اس کی تمام جماعتیں بشمول دینی ومذہبی جماعتیں ''ضمیر کی آواز دبانے'' کے اسی المیہ سے دوچار ہیں۔پاکستان میں اسلام کی ترویج اور اس کے غلبہ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قول وفعل کا تضاد (عدل وقسط کے بیج کو اپنی محدود جماعتی سطح پر ہی مار دینا اور کچل دینا) اور ضمیر کی آواز دبانے کا یہی مرض

ہے۔ یہ وہ بیماری ہے جو کسی بھی معاشرے کو عام دنیاوی فوائد اور نعمتوں سے بھی محروم کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال عالم اسلام اور تیسری دنیا کے ممالک ہیں جہاں ہر تعمیری اور اصلاحی آواز کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان معاشروں میں غربت، جہالت، بیماریاں، بے روزگاری، جرائم، ملاوٹ، غذائی بحران، بھوک، افلاس، قانون شکنی، تعصب، تنگ نظری، گروہ بندیاں.....غرض فساد اور بگاڑ کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ جو ''بیماری'' اور ''نحوست'' کسی معاشرے کو عام دنیاوی فوائد ونعمتوں سے محروم کر کے رکھ دیتی ہے، بھلا اس کے ہوتے ہوئے کائنات کی اعلیٰ ترین نعمت ''ہدایت اور اسلام'' کے غلبہ کی راہ کیسے ہموار ہو سکتی ہے؟ پاکستان کے دینی قائدین اور جماعتیں جب تک اس روگ اور اس بیماری سے جان نہیں چھڑاتیں اس وقت تک پاکستان میں اسلام کے غلبہ اور احیاء کی ان کی ہر آواز سوائے خود فریبی، ذہنی عیاشی اور ضیاع اوقات کے اور کچھ بھی نہیں۔

ہماری مذہبی و دینی قیادت کو یا تو قول وفعل کے تضادات اور ضمیر (اصلاح سیرت و کردار اور جماعتی لیول پر عدل وقسط کے لیے اٹھنے والی ہر مخلصانہ آواز) کا گلا گھونٹنے کی عادت سے جلد سے جلد جان چھڑا لینا چاہیے یا پھر اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو پھر وہ دینی قیادت کا منصب چھوڑ کر کوئی سا بھی دنیاوی کاروبار سنبھال لیں کہ اس سے روز آخرت کم از کم اسلام کی راہ روکنے اور اسلام کی بدنامی جیسے اعمال کے ارتکاب سے تو وہ بچ جائیں گے۔ اگرچہ ہمیں اس بات کا افسوس ہوگا کہ دینی خدمت کے اعلیٰ منصب کو چھوڑ کر یہ محترم شخصیات دنیاوی کاروبار میں مشغول ہو جائیں گی۔ تاہم دنیاوی کاروبار میں ضمیر کا گلا دبانے کی سزا کے مقابلے میں جب ہم دین کے کام میں ضمیر واصلاح کی آواز کا گلا دبانے کے جرم کی دنیاوی واخروی بھیانک سزا کا تصور کرتے ہیں تو ہم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

ہم یہاں یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ معروضات کسی خاص جماعت، کسی خاص گروہ یا کسی خاص شخصیت کے لیے پیش نہیں کی جا رہیں بلکہ قرآن حکیم اور سیرت رسول ﷺ کے ایک ادنیٰ طالب علم کا اپنی زندگی کے گزشتہ بیس سال پر محیط پاکستانی معاشرے کے نہ ختم ہونے والے اخلاقی، ایمانی، معاشرتی، معاشی، سیاسی، تعلیمی اور مذہبی بگاڑ، فساد اور تنزل پر کڑھن، کرب اور دینی و مذہبی جماعتوں کے تجربہ اور مطالعہ کا ماحصل ہے۔ ہم تمام دینی (خصوصاً قرآن وسنت کے نفاذ کی علمبردار) جماعتوں اور قائدین کا احترام کرتے ہیں اور ان سے دلی ہمدردی رکھتے ہیں۔ اسی احترام اور دلی ہمدردی ہی کا مخلصانہ تقاضا وہ قول حق ہے جس کا اظہار ہم نے سابقہ سطور میں کیا ہے۔

محترم چودھری محمد یوسف ایڈووکیٹ صاحب ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنی محبوب جماعت کے معاملہ میں خود احتسابی کی روش اختیار کی ہے۔ ہم جماعت اسلامی سے اسلام پسند جماعت ہونے کی وجہ سے بے حد انس اور لگاؤ رکھتے ہیں ۔ ہم یہ بھی حسن ظن رکھتے ہیں کہ

وسائل،نظم،نظریاتی افرادی قوت،صلاحیتوں،لٹریچر اور مقاصد کے لحاظ سے جماعت اسلامی پاکستان کی سب سے مضبوط اور طاقتور جماعت ہے لیکن ان تمام زبردست اور شاندار خوبیوں کے باوجود انتخابات میں جماعت اسلامی کی پہاڑ جیسی شکستیں ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ الجزائر، فلسطین، تیونس، ترکی اور مصر وغیرہ میں تو اسلام پسندوں کو انتخابات میں فتح حاصل ہو جاتی ہے لیکن پاکستان کی طاقتور ترین نظریاتی دینی جماعت گزشتہ 66 سال سے بدترین شکستوں سے دوچار ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ خرابی کہاں ہے؟ محترم چودھری محمد یوسف صاحب نے اپنے تنقیدی تبصرہ میں کسی حد تک اس خرابی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ہمیں یقین واثق ہے کہ جس دن پاکستان کی اس سب سے بڑی جماعت کو اپنی ناکامیوں کا یہ 'ام الامراض'' سمجھ میں آ گیا اور جماعت کے ذمہ داران نے اس مرض پر قابو پا لیا، پاکستانی معاشرہ میں دین اور رجال دین کے احیا کا ایک سیلاب امنڈ پڑے گا، جسے نہ کوئی منافق مسلم حکمراں روک سکے گا، نہ امریکہ اور نہ ہی کوئی اور ابلیسی سامراجی طاقت۔

اسلام اور فکرِ مغرب　　سید خالد جامعی ☆

فکرِ مغرب سے مرعوب عالم دین
مولانا وحید الدین خاں - ایک فکری جائزہ

جولائی ۲۰۱۳ء کے البرہان میں مولانا وحید الدین خان صاحب نے ''فکرِ مغرب''، ''فکر اسلامی'' اور سائنس، سائنٹفک میتھڈ، سائنسی علوم اور اسلام میں تطبیق و تلفیق پیدا کرنے کے لیے عقلی و نقلی دلائل دیے ان دلائل کا جائزہ ہم مغربی فکر و فلسفے اور سائنس کی روشنی میں مغربی مفکرین، سائنس دانوں اور فلاسفہ کی تحریروں سے پیش کریں گے۔ امید ہے کہ خان صاحب ان مصادرِ علمی پر سنجیدہ غور و فکر کر کے سائنس اور فلسفۂ مغرب کے بارے میں اپنی غلط آراء سے رجوع کر لیں گے۔ ہم نہایت ادب سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ خان صاحب نے مغربی فلسفے، جدید سائنس اور فلسفۂ سائنس کے مصادر کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ وہ خطیبانہ بیانات نہ دیتے۔ مغرب کے بارے میں ان کی تحقیق درست نہیں ہے اور مغربی فلسفے سے وہ واقف نہیں ہیں ورنہ کبھی یہ دعویٰ نہ کرتے کہ اسلام اور مغربی فلسفہ و فکر میں کوئی اختلاف نہیں حالانکہ جدید فلاسفہ کا اجماع ہے کہ جدید مغربی فلسفہ مذہب دشمن فلسفہ ہے۔ اس سلسلے میں فی الحال ہم برٹنڈ رسل اور امریکہ کے سب سے بڑے فلسفی رچرڈ رارٹی کی تحریروں سے اہم حوالے پیش کریں گے۔ خان صاحب نے سائنس کی مطلقیت اور وحی کے مماثل علم ہونے کا جو غیر علمی دعویٰ کیا ہے اس کا جائزہ ہم فلسفۂ سائنس کے اہم ترین مفکرین تھامس کوہن، امرلے کاٹوش اور پال فیرا بینڈ اور اس صدی کے سب سے بڑے سائنس دان رچرڈ فائن مین، جو کوانٹم فزکس میں نوبل انعام یافتہ مفکر ہیں، کے افکار کی روشنی میں بیان کریں گے۔

مولانا کے دلائل

۱۔ فکرِ مغرب کیا ہے؟ سائنسی طرزِ فکر کا نام ہے اور سائنسی طرزِ فکر پورے معنوں میں ایک درست طرزِ فکر ہے۔ مغربی فکر نہ غیر اسلامی فکر ہے نہ وہ کسی اعتبار سے اسلام دشمن فکر ہے [ص ۳۹] مغرب اور فکرِ مغرب اسلام دشمن نہیں ہے [ص ۴۲]

۲۔ علم عقلی اور علم نقلی دونوں مستند علم ہیں۔ [ص ۲۹] علم نقلی سے مراد مبنی بر وحی علم ہے اور علم عقلی سے مراد وہ علم ہے جو عقل انسانی پر مبنی ہو تاہم علم عقلی سے مراد وہ علم نہیں جو عباسی دور کے معتزلہ و متکلمین کے

☆ ناظم، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی

درمیان پایا جاتا تھا بلکہ توسیعی طور پر اس سے مراد سائنسی دور کا وہ جدید علم بھی ہے جس کو عقلی علم (Rational Knowledge) کہا جاتا ہے۔[ص۳۹]

۳۔ سائنس پورے علم حقیقت کا احاطہ نہیں کرتی وہ حقیقت کا صرف جزئی علم دیتی ہے[ص۴۵]

۴۔ سائنسی دور کا عملی نتیجہ یہ تھا کہ قابل پیائش [measurable] کو نا قابل پیائش [non measurable] سے الگ کر دیا گیا[ص۴۵] اس کے نتیجے میں علمی دنیا میں فکر کا وہ طریقہ رائج ہوا جسے موضوعی طریق مطالعہ [Objective method of study] کہا جاتا ہے اس طریقے کو رواج عام حاصل ہوگیا۔[ص۴۵]

۵۔ جدید تہذیب اہل مغرب کی کوششوں سے وجود میں آئی یہ منصوبۂ خداوندی کا حصہ ہے تاکہ اللہ کا دین روایتی دور سے نکل کر سائنسی دور تک پہنچے تاکہ اللہ کی معرفت کے اعلیٰ پہلو انسان پر کھلیں تاکہ قرآن کے مخفی عجائب معلوم واقعہ بن جائیں یہ سب اللہ کو مطلوب تھا مغربی تہذیب کے ذریعے اسی مطلوب الٰہی کی تکمیل ہوئی ہے۔[ص۴۷]

۶۔ سائنس کا دور ایمان بالغیب کے بجائے ایمان بالشہود کا دور کہا جائے گا[ص۴۵]

۷۔ سائنسی علم اسلام کے لیے ایک تائیدی علم کی حیثیت رکھتا ہے اس سے اسلام کو بہت زیادہ فائدے ہوئے[ص۴۰]

۸۔ اسلام پورے معنوں میں ایک عقلی مذہب ہے۔

۹۔ سائنس نے علم وحی کا انکار نہیں کیا صرف علم وحی کو اپنے دائرہ سے باہر قرار دیا کہ علم وحی قابل تصدیق نہ تھا[ص۴۰]

۱۰۔ نظریاتی سائنس نے فطرت میں چھپے ہوئے قوانین دریافت کرکے قرآن کی آیات کی تفصیلات بیان کیں تاکہ ایمان میں اضافہ ہولیکن بعد کے زمانے کے مسلمان یہ کام نہیں کرسکے۔[ص۴۱]

۱۱۔ پرنٹنگ پریس اور کمیونی کیشن سے تاریخ میں پہلی بار دین حق دنیا کے تمام انسانوں تک پہنچنے کا امکان پیدا ہوگیا[ص۴۱،۴۲] میڈیا سے اس حدیث پر عمل کا امکان پیدا ہوگیا ہے کہ زمین کی سطح پر کوئی گھر ایسا باقی نہ رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہوجائے (لایبقی علی ظھر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخله الله کلمة الاسلام) یہ موقع جدید سائنس نے پیدا کیا ہے[ص۴۲]

۱۲۔ مغرب میں شراب کا رواج آزادی کا غلط استعمال ہے خود فکر مغرب سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں۔

۱۳۔ ڈارون ازم، فرائیڈ ازم، مارکس ازم جیسے نظریات کا فکر مغرب سے کوئی تعلق نہیں یہ نظریات بلا شبہ اسلام کی تعلیمات کے خلاف تھے ہم کو ان کی تردید کرنی چاہیے مگر یہ درست نہیں کہ ہم ان نظریات کے حوالے سے خود فکر مغرب کو غلط سمجھنے لگیں [ص ۴۴]

مولانا کے ان افکار کا خلاصہ ہم چند نکات میں بیان کریں گے اور پھر ان کے بارے میں اپنی گزارشات پیش کریں گے:

۱۔ علم وحی [علم نقلی] اور علم عقلی [جدید سائنسی علم] دونوں مستند علم ہیں

۲۔ نظریاتی سائنس نے قوانین فطرت دریافت کر کے قرآنی آیات کی تفصیلات بیان کیں لیکن بعد کے زمانے کے مسلمان یہ کام نہ کر سکے۔

۳۔ سائنس کے ذریعے قرآن کے مخفی عجائب معلوم واقعہ بن گئے سائنس کے ذریعے دین روایتی دور سے نکل کر سائنسی دور تک پہنچا یہ اللہ کو مطلوب تھا مغربی تہذیب کے ذریعے مطلوب الٰہی کی تکمیل ہوئی۔

۴۔ فکر مغرب اسلام دشمن یا مذہب دشمن فکر نہیں ہے۔

۵۔ اسلام ایک عقلی مذہب ہے۔

کیا سائنس مستند علم ہے؟ کیا سائنس، عقلی علم کا درجہ وحی الٰہی کے برابر ہے؟

مولانا وحید الدین خان صاحب مغربی فکر و فلسفے کی تاریخ سے اکثر و بیشتر برٹینڈ رسل اور اس کی کتاب تاریخ فلسفۂ مغرب (History of Western Philosophy) کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں رسل ہی مغرب کا سب سے بڑا مفکر ہے جو درست خیال نہیں۔ ان کا ممدوح رسل اپنی کتاب تاریخ فلسفۂ مغرب میں مذہب اور سائنس کا تقابل کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ مذہبی دعوے حتمی، مطلق، یقینی اور ناقابل تغیر ہوتے ہیں جب کہ سائنس کے دعوے اور سائنسی نتائج مطلق، حتمی، یقینی نہیں ہوتے وہ عارضی، وقتی، آزمائشی، قابل تردید، قابل تصحیح و ترمیم ہوتے ہیں ان میں ہمہ وقت تغیر اور اصلاح کی گنجائش ہوتی ہے۔

Pronouncements of science are made tentatively, on a basis of probablity and are regarded as liable to modification.

مذہب اور سائنس کے فرق کی تفصیل رسل کے الفاظ میں پڑھیے:

The authority of science, which is recognized by most philosophers of the modern epoch, is a very different thing from the authority of the Church.

It prevails solely by its intrinsic appeal to reason. It is, moreover, a piecemeal and partial authority; it does not, like the body of Catholic dogma, lay down a complete system, covering human morality, human hopes, and the past and future history of the universe. It pronounces only on whatever, at the time, appears to have been scientifically ascertained, which is a small island in an ocean of nescience. There is yet another difference from ecclesiastical authority, which declares its pronouncements to be absolutely certain and eternally unalterable: the pronouncements of science are made tentatively, on a basis of probability, and are regarded as liable to modification. This produces a temper of mind very different from that of the medieval dogmatist.

سائنسی علم اور سائنٹفک میتھڈ کا جو فلسفہ تھامس کوہن نے بیان کیا ہے اس کی روشنی میں فلسفۂ سائنس کے ایک اہم مفکر فیرار بینڈ کا خیال ہے کہ منظّم جرم اور آکسفرڈ کا فلسفہ بھی سائنس کے معیار پر پورا اترتا ہے یعنی سائنس ایک ایسا علم ہے جو فلسفے اور جرم کو بھی بحیثیت علم کے سمو لیتا ہے:

"Kuhn's demarcation criterion has been criticized by Popper on the grounds that it gives undue emphasis to the role of criticism in science; by Lakatos because, among other things, it misses the importance of competition between research programmes (or paradigms); and by Feyerabend on the grounds that Kuhn's distinction leads to the conclusion that organized crime and Oxford philosophy qualify as science."

مولانا وحید الدین خان اس بات سے ناواقف ہیں کہ سائنس اور سوشل سائنس کے اصولوں کے مطابق (۱) جس علم میں شک نہ کیا جاسکے، (۲) جس علم کی تردید نہ کی جاسکے، (۳) جس علم کو اسی ذریعے اور طریقے سے حاصل نہ کیا جاسکے، جس کے حصول کا دعویٰ کسی اور نے کیا ہو (۴) جس علم کی پیائش نہ کی جاسکے (۵) وہ علم جسے ریاضی کی زبان میں بیان نہ کیا جاسکے (۶) وہ علم جس کا مشاہدہ اور تجربہ نہ کیا جاسکے وہ علم علم نہیں توہمات، مفروضات اور جہالت کہلاتا ہے۔ یونیورسٹی آف شکاگو میں سوشل ریسرچ کی عمارت پر جلی حروف میں درج ہے کہ اگر آپ کا علم پیائش کرنے سے قاصر ہے تو آپ کا علم قلیل اور غیر تسلی بخش ہے یعنی علم کے دائرے سے خارج ہے۔ چامر اپنی کتاب میں شکاگو یونیورسٹی کی عمارت پر درج

عبارت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

An inscription on the facade of' the Social Science Research Building at the University of Chicago reads, "If you cannot measure, your knowledge is meagre and unsatisfactory". No doubt, many of its inhabitants, imprisoned in their modern laboratories, scrutinize the world through the iron bars of the integers, failing to realize that the method that they endeavour to follow is not only necessarily barren and unfruitful but also is not the method to which the success of physics is to be attributed.

فلسفہ سائنس کے مفکرین سائنسی علم کو نہ حتمی سمجھتے ہیں نہ مطلق۔ کوئی ایسا طریقہ اور ذریعہ ابھی تک میسر نہیں ہے جس کے ذریعے سائنسی نظریات کی حتمی صداقت یا ممکنہ صداقت ثابت کی جا سکے فلسفہ سائنس کا مفکر چارمر لکھتا ہے

Modern developments in the philosophy of science have pinpointed and stressed deep-seated difficulties associated with the idea that science rests on a sure foundation acquired through observation and experiment and with the idea that there is some kind of inference procedure that enables us to derive scientific theories from such a base in a reliable way. There is just no method that enables scientific theories to be proven true or even probably true. Later in the book, I will argue that attempts to give a simple and straightforward logical reconstruction of the "scientific method" encounter further difficulties when it is realized that there is no method that enables scientific theories to be conclusively disproved either.(A.F. Chalmers, *What is This Thing Called Science? An Assessment of the Nature and Status of Science and its Method*s.pXVi . Ibid., p.1).

کارل پاپر سائنسی علم کے حصول کی کوشش کو ارتقائی عمل کے ذریعے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ سائنس پاپر کے اصول تردیدیت [Falcification method] کے ذریعے آگے بڑھتی ہے اور اس کا سفر جاری رہتا ہے۔ سائنس میں کچھ مطلق نہیں ہوتا۔ ہر لمحے ہم سچ اور حقیقت کے تلاش کے سفر میں رہتے ہیں لہٰذا سائنسی جدوجہد اور سائنسی علم محض سچ کو مطلق طور پر پانے کی جدوجہد بن جاتی ہے جسے ہم کبھی

حاصل نہیں کر پاتے:

I can therefore gladly admit that falsificationists like myself much prefer an attempt to solve an interesting problem by a bold conjecture, *even (and especially) if it soon turns out to be false*, to any recital of a sequence of irrelevant truisms. We prefer this because we believe that this is the way in which we can learn from our mistakes; and that in finding that our conjecture was false we shall have learnt much about the truth, and shall have got nearer to the truth. (K. R. Popper , *Conjectures & Refutations,* London: Routledge & Kegan Paul, 1969, p. 231).

سائنس محض اندازے، قیاس اور گمان کا نام ہے۔ اس صدی کا آئن اسٹائن کوانٹم فزکس کا سب سے بڑا سائنس داں رچرڈ فائن مین لکھتا ہے:

Each piece, or part, of the whole of whole nature is always merely an *approximation* to the complete truth, or the complete truth so far as we know it. In fact, everything we know is only some kind of approximation, because *we know that we do not know all the laws* as yet. Therefore, things must be learned only to be unlearned again or, more likely, to be corrected.

Finally, and most interesting, *philosophically we are completely wrong* with the approximate law. Our entire picture of the world has to be altered even though the mass changes only by a little bit. This is a very peculiar thing about the philosophy, or the ideas, behind the laws. Even a very small effect sometimes requires profound changes in our ideas.(Richard P. Feynman, *Six Easy Pieces: Essentials of Physics Explained by Its Most Brilliant Teacher*, USA: Helix Books,1995,pp.2-3.)

سائنس کی حقیقت کے بارے میں فائن مین کی کتاب Six Easy Pieces کے دیباچہ نگار نے بہت اہم بات لکھی ہے کہ سائنس کا علم، سائنسی تجربہ، سائنسی نتائج معروضی [Objectivly] نہیں ہوتے یعنی وہ موضوعی [Subjective] ہوتے ہیں لیکن محترم خان صاحب سائنس کو ایک معروضی علم کے طور پر پیش کر رہے ہیں:

There is a popular misconception that science is an impersonal, dispassionate, and thoroughly objective enterprise. Whereas most other human activities are dominated by fashions, fads, and personalities, science is supposed to be constrained by agreed rules of procedure and rigorous tests. It is the results that count, not the people who produce them.

This is, of course, manifest nonsense. Science is a people-driven activity like all human endeavor, and just as subject to fashion and whim.(Ibid.,p.ix.)

سائنس مطلقیت کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ طبیعیات کو سائنس کی ملکہ [Queen of sciences] کہا جاتا ہے جس کی اعلیٰ ترین شاخ کوانٹم فزکس ہے۔ کوانٹم فزکس کا سب سے بڑا آدمی فائن مین لکھتا ہے کہ ہمارے تجربات کے نتائج محض ممکنہ سچ ہو سکتے ہیں مطلق سچ نہیں

It would be impossible to predict exactly what would happen. We can only predict the odds! This would mean, if it were true, that physics has given up on the problem of trying to predict exactly what will happen in a definite circumstance. Yes! Physics has given up. We do not know how to predict what would happen in a given circumstance, and we believe now that it is impossible, that the only thing that can be predicted is the probability of different events. It must be recognized that this is a retrenchment in our earlier ideal of understanding nature. It may be a backward step, but no one has seen a way to avoid it.(Ibid.,p.134.)

مولانا وحید الدین صاحب جیسے سائنس پرستوں کے لیے فائن مین نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شے سائنس نہیں ہے یا سائنس کے معیار و اصول پر پورا نہیں اترتی تو اس سے اس علم کی تحقیر و تضحیک لازم نہیں آتی۔ محبت سائنس نہیں ہے اور سائنس محبت کی تصدیق و تائید سے قاصر ہے لیکن اگر محبت سائنس نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ محبت ٹھیک اور درست نہیں ہے کیونکہ محبت سائنس کے اصولوں کے معیار پر نہیں اترتی اور قابل پیمائش بھی نہیں ہے۔

If a thing is not a science it is not necessarily bad, for example love is not a science so if something is said not to be a science, it

does not mean that there is something wrong with it, it just means that it is not a science. (Ibid.,p.84.)

وحیدالدین خان صاحب کا خیال ہے کہ سائنسی نظریات، سائنٹفک عقیدے، سائنس دانوں کے دریافت کردہ قوانین جن کو محترم خان صاحب قوانین فطرت کہتے ہیں یہ حتمی، ابدی، مطلق، غیر متغیر، دائمی، لازمی ہوتے ہیں لیکن یہ محترم خان صاحب کا خیال ہے جو نہ فلسفۂ مغرب پر عبور رکھتے ہیں اور نہ فلسفۂ سائنس پر نہ جدید سائنس کے اہم مکاتب فکر سے واقف ہیں۔

خان صاحب کی رائے کے مقابلے میں ہم آپ کی خدمت میں اس صدی کے آئن اسٹائن فائن مین کی رائے پیش کرتے ہیں جو لکھتا ہے کہ کسی بھی مطلق سائنسی نظریے [Definite theory] کو غیر معتبر، غیر مستند، قابل تردید [Disprove] ثابت کیا جاسکتا ہے کسی بھی سائنسی نظریے کو کبھی بھی غلط ثابت کر کے اس سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے اگر کسی سائنسی نظریے کو درست تصور کیا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ فی الواقع درست ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس سائنسی نظریے کی ابھی تک تردید نہیں کی جاسکی لہٰذا کوئی بھی سائنسی نظریہ، یا سائنسی نتیجہ حتمی اور مطلق نہیں ہوتا، وہ کسی بھی لمحے تبدیل ہوسکتا ہے اور اس میں خطاء، تردید، تصحیح، ترمیم کا امکان ہمہ وقت موجود رہتا ہے کیونکہ سائنس اسی طریقے سے ترقی کرتی ہے۔

You can see, of course, that with this method we can attempt to disprove any definite theory. If we have a definite theory, a real guess, from which we can conveniently compute - consequences which can be compared with experiment, then in principle we can get rid of any theory. There is always the possibility of proving any definite theory wrong; but notice that we can never prove it right. Suppose that you invent a good guess, calculate the consequences, and discover every time that the consequences you have calculated agree with experiment. The theory is then right? No, it is simply not proved wrong. In the future you could compute a wider range of consequences, there could be a wider range of experiments; and you might then discover that the thing is wrong. That is why laws like Newton's laws for the motion of planets last such a long time. He guessed the law of gravitation, calculated all kinds of consequences for the system and so on, compared them with experiment and it took: several hundred

years before the slight error of the motion of Mercury was observed.

During all that time the theory had not been proved wrong. and could be taken temporarily to be right. But it could never be proved right, because tomorrow's experiment might succeed in proving wrong what you thought was right. We never are definitely right. we can only be sure we are wrong.

Another thing I must point out is that you cannot prove a vague theory wrong. If the guess that you make is poorly expressed and rather vague, and the method that you use for figuring out the consequences is a little vague-you are not sure, and you say, "I think everything's right because its all due to so and so, and such and such do this and that more or less, and I can sort of explain how this works. . . ," then you see that this theory is good, because it cannot be proved wrong! 99-100
What of the future of this adventure? What will happen ultimately? We are going along guessing the laws; how many laws are we going to have to guess? I do not know. Some of my colleagues say that this fundamental aspect of our science will go on; but I think there will certainly not be perpetual novelty, say for a thousand years. This thing cannot keep on going so that we are always going to discover more and more new laws. If we do, it will become boring that there are so many levels one underneath the other. **1.** Richird Feynman, *The Character of Physical Law*. Page (9,11,17) MIT Press

مولانا وحید الدین خان سائنسی تحقیقات میں مسلسل ارتقاء، تغیر، تبدیلی کی حرکیات سے بھی ناواقف ہیں۔ انہوں نے سائنس کی تاریخ اور ایجادات کی تاریخ حتی کہ سائنسی نظریات کی تاریخ کا بھی مطالعہ نہیں کیا ونہ وہ کبھی یہ نہ لکھتے کہ وحی کا علم اور سائنس کا علم یکساں سطح کے یقینی، حقیقی اور مطلق علم ہیں۔ ٹالمی اور کاپر نیکس دونوں نے ریاضیاتی بنیادوں پر زمین کے بارے میں دو مختلف نظریے پیش کیے۔ ایک کی رائے تھی کہ زمین ساکن ہے۔ ٹالمی کا نظریہ دو ہزار سال تک سائنس، فلسفے اور مذہب کی دنیا میں قبول کیا گیا بلکہ

شاید تاریخ انسانی میں یہ واحد عقلی معاملہ تھا جس پر سائنس فلسفے اور مذہب کا اجماع تھا۔ پندرہویں صدی میں کاپرنیکس نے ریاضیاتی بنیادوں پر اس کی تردید کی مگر طبیعیاتی اور تجرباتی بنیادوں پر ٹالمی کے نظریے کی تصدیق ہوئی۔ کاپرنیکس اپنے درست نظریے کے لیے کوئی طبعی تجربی عملی شہادت پیش نہیں کر سکا زمین ہر آنکھ کو ساکن نظر آتی تھی اور سورج ہر آنکھ کو گردش میں نظر آتا تھا۔ کاپرنیکس کے اس مفروضے کو ایک ممکنہ حقیقت Probable Truth بننے کے لیے دوسو سال کا عرصہ لگا برٹینڈ رسل لکھتا ہے:

The first serious irruption of science was the publication of copernican thoery in 1543 but this theory did not become influential until it was taken up and improved by kepler & Gallileo in the seventeeth century. [Page 1 , Chapter 1, General Characteristics, Part One from Renaissance to Hume]

کیا قرآن، الحق، وحی الٰہی، سائنسی عقلی علم کی طرح ارتقاء کی انہی منزلوں سے گزر کر اپنی موجودہ شکل تک پہنچے ہیں؟

روشنی کے بارے میں Wave Theory of light سے لے کر Packet theory of light تک سائنسی، تجربی ارتقاء کی کئی منازل ہیں پیکٹ تھیوری کو مذاق سمجھ کر سائنس دانوں نے رد کر دیا تھا سائنس کے ارتقائی سفر کی کہانی فائن مین بیان کرتا ہے۔

Newton thought that light was made up of particles, but then it was discovered, as we have seen here, that it behaves like a wave. Later, however (in the beginning of the twentieth century) it was found that light did indeed sometimes behave like a particle. Historically, the electron, for example, was thought to behave like a particle, and then it was found that in many respects it behaved like a wave. So it really behaves like neither. Now we have given up. We say: "It is like neither." There is one lucky break, however-electrons behave just like light. The quantum behavior of atomic objects (electrons, protons, neutrons, photons, and so on) is the same for all; they are all "particle waves," or whatever you want to call them. So what we learn about the properties of electrons (which we shall use for our examples) will apply also to all "particles," including photons of light. Ibid.,p.116.

سوال یہ ہے کہ ارتقائی علم وحی الٰہی کے مساوی کیسے ہوسکتا ہے؟ وحی الٰہی مطلق علم ہے اسے ارتقاء کی ضرورت نہیں۔

کیا سائنسی نظریات مذہب کی طرح مکمل نا قابل تغیر، ٹھوس، حقیقی، واقعی عقیدے ہوتے ہیں یا وہ محض علمی مفروضے ہوتے ہیں جو نیوٹن سے لے کر آئن اسٹائن تک بدلتے رہتے ہیں اور مستقبل میں بھی ہمیشہ بدلتے رہیں گے کوانٹم فزکس کے فائن مین کی شہادت پڑھیے:

Finally let us compare gravitation with other theories. In recent years we have discovered that all mass is made of tiny particles and that there are several kinds of interactions, such as nuclear forces, etc. None of these nuclear or electrical forces has yet been found to explain gravitation. The quantum-mechanical aspects of nature have not yet been carried over to gravitation When the scale is so small that we need the quantum effects, the gravitational effects are so weak that the need for a quantum theory of gravitation has not yet developed. On the other hand, for consistency in our physical theories it would be important to see whether Newton's law modified to Einstein's law can be further modified to be consistent with the uncertainty principle. This last modification has not yet been completed. (Ibid., p.113.)

سائنس کی بے حقیقتی اور بے ثباتی کے بارے میں فائن مین لکھتا ہے:

The law of conservation of energy is a theorem concerning quantities that have to be calculated and added together, with no mention of the machinery, and likewise the great laws of mechanics are quantitative mathematical laws for which no machinery is available. We use mathematics to describe nature without a mechanism behind it? No one knows. We have to keep going because we find out more that way. Many mechanisms for gravitation have been suggested. It is interesting to consider one of these, which many people have thought of from time to time. At first, one is quite excited and happy when he "discovers" it,

but he soon finds that it is not correct. (Ibid., pp. 107-108 .)

مولانا وحیدالدین خان کوانٹم سائنس کے ایک اہم نظریے Uncertainity Principle سے بھی ناواقف ہیں اصول غیر یقینی۔ جب سائنس خود بتا رہی ہے کہ وہ غیر یقینی ہے تو خان صاحب وحی کے یقینی علم اور سائنس کے غیر یقینی علم کو یکساں درجہ کیسے دے رہے ہیں اور غیر یقینی سائنس سے یقینی وحی کی تائید کیسے حاصل کر رہے ہیں وحی مطلق، غیر متغیر، حتمی، ابدی، نا قابل ترمیم ہے جبکہ سائنس غیر مطلق، متغیر، عارضی، غیر یقینی اور قابل ترمیم ہے تو دونوں یکساں درجے کے علوم کیسے ہو سکتے ہیں فائن مین لکھتا ہے:

The uncertainty principle "protects" quantum mechanics. Heisenberg recognized that if it were possible to measure the momentum and the position simultaneously with a greater accuracy, the quantum mechanics would collapse. (Ibid., p38.)

کارل پاپر اپنی کتاب *Cojectures & Refutations* میں سائنس کی حقیقت خود بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگر کسی سائنسی نظریے کی تردید و تنسیخ ممکن نہیں ہے تو ایسا نظریہ غیر سائنسی ہے۔ ہر نظریے کو پرکھنے کا تجربہ اس نظریے کی تردید کا تجربہ ہے۔ اگر سائنس مطلق سچ ہے تو خان صاحب بتائیں کہ اس کو رد کرنے کے لیے کیوں پرکھا جا رہا ہے اور اس کے رد ہونے کے عمل سے ہی اس کو سائنسی سمجھا جا رہا ہے تو خان صاحب سائنس کو مطلق علم کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ جو وحی الٰہی کے برابر بھی ہے۔

4. A theory which is not refutable by any conceivable event is non-scientific. Irrefutability is not a virtue of a theory (as people often think) but a vice.

5. Every genuine test of a theory is an attempt to falsify it, or to refute it. Testability is falsifiability; but there are degrees of testability: some theories are more testable, more exposed to refutation, than others; they take, as it were, greater risks.

پاپر کے خیال میں سائنسی نظریات افسانے، فرضی داستان یعنی Myths سے تخلیق ہوتے ہیں یہ تجربے اور غلطیوں کے آمیختے سے برآمد ہوتے ہیں۔

At the same time I realized that such myths may be developed, and become testable; that historically speaking all - or very nearly all - scientific theories originate from myths, and that a myth may

contain important anticipations of scientific theories. Examples are Empedocles' theory of evolution by trial and error, or Parmenides' myth of the unchanging block universe in which nothing ever happens and which, if we add another dimension, becomes Einstein's block universe (in which, too, nothing ever happens, since everything is, four-dimensionally speaking, determined and laid down from the beginning). I thus felt that if a theory is found to be non-scientific, or "metaphysical" (as we might say), it is not thereby found to be unimportant, or insignificant, or "meaningless," or "nonsensical." But it cannot claim to be backed by empirical evidence in the scientific sense - although it may easily be, in some genetic sense, the "result of observation. (K. P. Popper, *Conjectaues and Refutation.* London: Routledge & Kegan Paul, 1963, pp. 36-39 .)

سائنس کی حقیقت کے بارے میں پاپر لکھتا ہے:

Science is not a quest for certain knowledge but an evolutionary process in which hypothesis or conjectectures are imaginatively proposed and tested in order to explain facts or to solve problems.

سائنس کی حقیقت اور سائنٹفک میتھڈ کی اصلیت جاننے کے لیے خان صاحب اگر Paul Feyerabend کی معرکہ آراء کلاسیکل کتاب Against Method پڑھ لیں تو سائنس سائنٹفک میتھڈ پر وحی کی طرح ان کا یقین چند دنوں میں زائل ہو جائے گا۔ وہ سائنس اور افریقہ کے کالے جادو میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا اگر خدانخواستہ سائنس کالا جادو ہے اور خان صاحب کے خیال میں سائنس اور وحی الٰہی میں کوئی فرق نہیں ہے تو کیا وحی الٰہی کو کالے جادو کے مماثل قرار دینا دینی روایت اور علمیت میں ایک جائز کام ہوگا؟ فیرار بینڈ لکھتا ہے کہ سائنسی علم دوسرے علوم کے مقابلے میں کسی برتری اور فوقیت کا حامل نہیں سائنس قدیم افسانہ،فرضی داستان، دیوتاؤں کی کہانی[Myth] اور Voodoo افریقہ کے کالے جادو یا سفلی جادو اور سفلی عمل کی طرح ایک علم ہے۔ سائنس پرستی اور سائنس کا حد سے زیادہ احترام سائنس کو جدید مذہب بنا دیتا ہے جو وہی کردار ادا کر رہی ہے جو کردار کبھی کلیسا ادا کرتا تھا۔ چامر فیرار بینڈ کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتا ہے:

science has no special features that render it intrinsically superior to other branches of knowledge such as ancient myths or Voodoo. A high regard for science is seen as the modern religion, playing a similar role to that played by Christianity in Europe in earlier eras. It is suggested that the choice between theories boils down to choices determined by the subjective values and wishes of individuals.

سائنس پرستوں کی خدمت میں اس صدی کے فلسفہ سائنس کے ایک بڑے مفکر امرے لاکاٹوش کی تحریر پیش خدمت ہے جس نے سائنس کے ٹھوس، مطلق، حقیقی علم ہونے کی تردید درج ذیل مثال سے کی ہے اور سائنس پرستوں کے کلامی دلائل کا جو وحیدالدین خان صاحب کے عقلی دلائل کی طرح ہیں بہترین محاکمہ کیا ہے۔

The story is about an imaginary case of planetary misbehaviour. A. physicist of the pre Einstenian era takes Newton's mechanics and his law of gravitation, N, the accepted initial conditions, I, and calculates, with their help, the path of a newly discovered small planet, p, But the planet deviates from the calculated path. Does our Newtonian physicist consider that the deviation was forbidden by Newton's theory and therefore that, once established, it refutes the theory N? No. He suggests that there must be a hitherto unknown planet p', which perturbs the path of p. He calculates the mass, orbit, etc. of this hypothetical planet and then asks an experimental astronomer to test his hypothesis. The planet p' is so small that even the biggest available telescopes cannot possibly observe it; the experimental astronomer applies for a research grant to build yet a bigger one. In three years time, the new telescope is ready. Were the unknown planet p' to be discovered, it would be hailed as a new victory of Newtonian science. But it is not. Does our scientist abandon Newton's theory and his idea of the perturbing planet? No. He suggests that a cloud of cosmic dust hides the planet from us. He calculates the location and properties of this cloud and asks for a research grant

to send up a satellite to test his calculations. Were the satellite's instruments (possibly new ones, based on a little-tested theory) to record the existence of the conjectural cloud, the result would be hailed as an outstanding, victory for Newtonian science. But the cloud is not found. Does our scientist abandon Newton's theory, together with the idea of the perturbing planet and the idea of the cloud which hides it'? No. He suggests that there is some magnetic field in that region of the universe which disturbed the instruments of the satellite. A new satellite is sent up. Were the magnetic field to be found, Newtonians would celebrate a sensational victory. But it is not. Is this regarded as a refutation of Newtonian science? No. Either yet another ingenious auxiliary hypothesis is proposed or the whole story is buried in the dusty volumes of periodicals and the story never mentioned again. Falsification & methodology of scientific research"(***1.*** Imre Lakatos & A Musgrave[ed.], *Falsification & the Methodology of Scientific Research Programmes in Criticism and the Growth of Knowledge,* Cambridge: Cambridge University Press, 1974, p.100-101.)

[ترجمہ]''ایک سائنس دان کسی سیارے کے مدار کے بارے میں نیوٹن کے نظریۂ کشش ثقل کے تحت مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔فرض کریں کہ اس سیارے کے مشاہدہ کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریے کے بتائے ہوئے مدار پر سفر نہیں کر رہا۔کیا وہ اس سے یہ نتیجہ نکالے گا کہ نیوٹن کا نظریہ کشش ثقل غلط ہے؟ ہر گز نہیں بلکہ وہ یہ کہے گا اس سیارے کے نزدیک اب کوئی نامعلوم سیارہ موجود ہوگا جس کی کشش کی وجہ سے زیر مطالعہ سیارہ اپنے مدار سے ہٹ کر سفر کر رہا ہے۔چنانچہ وہ اس نامعلوم سیارے کے وزن،حجم اور مدار کے بارے میں حساب وتخمینہ لگاتا ہے اور پھر اپنے ساتھی سائنس دانوں کو اس نامعلوم سیارے کے مشاہدہ کا کام سپرد کرتا ہے۔ہوسکتا ہے کہ نامعلوم سیارہ اتنا چھوٹا ہو کہ اب تک کی طاقتور ترین دوربین کی مدد سے بھی نہ دیکھا جاسکتا ہو۔لہٰذا وہ سائنس دان حکومت سے ریسرچ کی مد میں فنڈ مانگتے ہیں تاکہ ایک بڑی اور طاقتور دوربین تیار کی جاسکے۔لگ بھگ تین برس کے عرصے میں ایک نئی دوربین تیار کر لی جاتی ہے۔اگر تو اس دوربین کی مدد سے وہ نامعلوم سیارہ نظر آجائے تو سائنس دان خوشیاں منائیں گے کہ نیوٹن کے نظریے کی ایک بار پھر تصدیق ہوگئی۔فرض کریں وہ نامعلوم سیارہ دوربین میں دکھائی نہیں دیتا۔کیا

سائنس دان اسے نیوٹن کے نظریے کی شکست تسلیم کرلیں گے؟نہیں بلکہ وہ کہیں گے کہ دراصل ایک فضائی بادل [cloud of cosmic dust] نے اس نامعلوم سیارے کوڈھانپ رکھا ہے جس کی وجہ سے وہ سیارہ ہمیں نظر نہیں آیا۔ چنانچہ سائنس دان مزید ریسرچ فنڈ مانگتے ہیں تاکہ ایک خلائی شٹل بادل کے مشاہدے کے لیے بھیجی جاسکے۔ اگر خلائی شٹل کسی ایسے بادل کی نشاندہی کردے تو اسے نیوٹن کے نظریے کی زبردست کامیابی قرار دیا جائے گا۔لیکن فرض کریں وہ بادل بھی نہ پایا جائے کیا اب سائنس دان نیوٹن کے نظریۂ کششِ ثقل بشمول اپنے خیالات کہ ایک نامعلوم سیارہ ہے یا یہ کہ ایک فضائی بادل ہے کی تردید کر دیں گے؟نہیں بلکہ اب وہ کہیں گے کہ کائنات کے اس حصے میں کوئی مقناطیسی قوت [Magnetic Field] ہے جس نے سٹیلائٹ کے آلات کو صحیح کام نہیں کرنے دیا ہوگا جس کی وجہ سے وہ بادل دریافت نہ ہوسکا۔ چنانچہ ایک نئی قسم کی خلائی شٹل تیار کر کے فضا میں بھیجی جاتی ہے۔ اگر وہ مقناطیسی قوت وہاں مل جائے تو نیوٹن کے مداح سائنس دانوں کی خوشی کی انتہا نہ ہوگی۔لیکن فرض کریں ایسا نہ ہوسکے۔کیا اب وہ نیوٹن کے نظریے کی شکست تسلیم کرلیں گے؟نہیں بلکہ وہ ایک نیا اضافی مفروضہ تراشیں گے............ یہاں تک کہ یہ سالوں پر محیط کہانی تحقیقی رسالوں کی اقساط میں دب کر گم ہوجاتی ہے اور پھر کبھی بیان نہیں کی جاتی''۔

علامہ جوہری طنطاوی نے تفسیر جواہر القرآن کے ذریعے تاریخ اسلامی میں پہلی مرتبہ قرآن کی سائنسی تفسیر کرنے کی کوشش کی۔ مذکورہ تفسیر صرف دس سال کے عرصے میں سائنسی ترقی کے باعث اس قابل نہ رہی کہ اسے علمی حلقوں میں پیش کیا جاسکے۔سائنسی نظریات میں اتنی تیزی سے تغیرات آرہے تھے کہ قرآن ان کا ساتھ دینے سے قاصر تھا لیکن سائنسی تفسیر کی لہر نے عالم اسلام کے موقر حلقوں کا احاطہ کرلیا۔اس موج بے کراں کی ایک صورت ترکی کے بدیع الزماں سعید نورسی کی تحریروں میں دیکھی جاسکتی ہے قرآن کی ہر آیت سے وہ کوئی نہ کوئی سائنسی ایجاد،نظریہ،اصول نکال کر دکھا دیتے ہیں۔ان کے علمی جانشین اب فتح اللہ گولن ہیں گولن صاحب کی تحریروں میں علامہ طنطاوی اور نورسی صاحب کے افکار کی بازگشت سنی جاسکتی ہے۔ عالم اسلام میں قرآن کی سائنسی تفسیر کا رویہ اب ایک مکتب فکر کی صورت ہے جس کی نمائندگی بے شمار علماء،مفکرین کررہے ہیں (اس سلسلے میں ایک مفصل تحریر زیرتسوید ہے) مولانا وحید الدین خان بھی اسی صف کے اہم لوگوں میں شامل ہیں۔

جدید مغربی سائنس کی عظمت جناب مولانا صاحب کے دل میں صرف اس لیے بیٹھی ہوئی ہے کہ حضرت والا نے کبھی جدید سائنس پر جدید مغرب کے مفکرین کا نقد نہیں پڑھا عالمی کانگریس کا صدر اور صف اول کا فلسفی ہزرل جدید سائنس کو یوروپی سائنس کہتا ہے۔اس نے ۱۹۲۲ء میں یوروپین سائنسز پر

تنقیدی کتاب Critique on Uropean Sciences لکھ دی تھی۔

اس کے شاگرد ہائیڈیگر نے ۱۹۲۶ء میں Question concerning technology لکھ کر ٹکنالوجی کے ممکنہ خطرات کی نشان دہی کر دی تھی۔

جدید سائنس کے بارے میں عالم اسلام خصوصاً عالم عرب کے دینی حلقوں میں جو وارفتگی اور شیفتگی پائی جاتی ہے اس کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہے محض ایک جذبہ ہے کہ اسلام کو مغرب کے لیے کسی بھی طرح قابل قبول بنایا جا سکے اور نسل نو کو دین سے وابستہ رکھنے کے لیے سائنس کے ذریعے کیوں نہ دینی روح زندہ رکھی جائے۔ مغرب، جس نے جدید سائنس کی تخلیق کی وہاں جدید سائنس پر جارحانہ تنقید جاری ہے وہاں سائنس کو وہ تقدس حاصل نہیں جو عالم اسلام میں حاصل ہے کیونکہ سائنس کی تقدیس کے قصیدے پڑھنے والے سائنس، فلسفہ سائنس، ٹیکنو سائنس [Techno Science]، سائنسزم [Scientism] استعماری سائنس زدگی [Imperialist scientism] کی اصطلاحات سے واقف نہیں وہ سائنس اور سرمایہ داری کے فطری تعلق سے بھی ناواقف ہیں۔ وہ صرف سائنس کے مظاہر و آثار اور اس کی جمالیاتی جہت کے باعث اسے تبلیغ دین کے کامل وسیلے کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں یہ جانے بغیر کہ عالم اسلام میں غرب زدگی [Westernization] جدیدیت زدگی [Modrenizaion] کے بعد سائنس زدگی کا رویہ لوگوں کو عقل پرستی کی طرف لے جائے گا اور عقل پرستی [Worship of Reason / rationalism] ہمیشہ دین، روایات اور نقل کے انکار تک پہنچاتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں متکلمین جو پابند شریعت عقلیت کے دائرے میں کلامی مباحث میں مصروف عمل رہتے تھے اپنے آخری دنوں میں جن مشکلات کا سامنا کرتے تھے اس کی تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ عقلیت محض کے دائرے میں محدود متعین مقید سفر بھی ایمان کے لیے بہت سے خطرات کا باعث بن سکتا ہے۔ University of Exeter میں ERSC Centre for Genomics in Society کے ڈائریکٹر John Dupre کی کتاب *The disorder of things:* اور *Human Nature and the Limits of Science* *Metapysical foundations of the Disunity of Science.* سائنس پرستوں کے لیے روشنی و رہنمائی کے بہت سے دریچے کھولتی ہے ہم خان صاحب کی خدمت میں پہلی کتاب سے آئندہ قسط میں چند اقتباسات پیش کریں گے [جاری ہے]۔

هم عصر دنیا

محمد عاصم حفیظ ☆

ہندو انتہا پسندی وتو ہم پرستی

بھارتی ریاست اتر پردیش کے اناؤ ضلع کے ایک گاؤں ڈونڈیا کھیڑا کے شیو مندر کے احاطے میں اس وقت آثار قدیمہ کے درجنوں ماہرین تیزی سے کھدائی میں مصروف ہیں۔ یہ ماہرین دور قدیم کی باقیات اور آبادیوں کے نشانات نہیں بلکہ ایک خزانے کی بازیابی کے لیے کھدائی کر رہے ہیں۔کہانی یہ ہے کہ کچھ عرصہ قبل اس مندر کے سادھو شوبھم سرکار کے خواب میں اس علاقے کے انیسویں صدی کے راجہ نظر آئے۔ انہوں نے ملک کی اقتصادی بدحالی پر بہت افسوس ظاہر کیا اور سادھو کو بتایا کہ 1857 کی بغاوت میں انگریزوں کے ہاتھوں مارے جانے سے قبل انہوں نے اس مندر کے احاطے میں ایک ہزار ٹن سونا دفن کر دیا تھا۔سادھو نے ایک مرکزی وزیر کو اپنے خواب کی اطلاع دی۔مرکزی حکومت کی ہدایت پر جیولاجیکل سروے آف انڈیا نے فوراً وہاں زمین کا جائزہ لیا۔مندر کے سادھو نے رات میں ایک مقام پر سحری کے وقت پوجا پاٹ کا اہتمام کیا اور آثار قدیمہ کے ماہرین سادھو کی بتائی ہوئی جگہ پر کھدائی میں لگ گئے ہیں۔ برطانوی نشریاتی ادارے بی بی سی نے اس عجیب وغریب واقعے پر اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ''بھارت توہمات اور بھوت وآسیب میں یقین رکھنے والے لوگوں سے بھرا پڑا ہے۔ بھارتی معاشرے کی طرح سیاست میں بھی جہالت کی کمی نہیں ہے اور بڑی تعداد میں سیاست دان ستاروں کی چال اور سادھوؤں کی ہدایت کے مطابق ہی اپنی زندگی کے اہم فیصلے کرتے رہے ہیں۔پچھلے کچھ سالوں میں ملک کی سیاست میں بے یقینی، کمپٹیشن میں شدت اور اندھادھند بدعنوانی اور لوٹ پر کچھ قابو آنے سے سیاست دانوں میں سادھوؤں کی طرف مائل ہونے کا چلن کافی بڑھا ہے۔ بڑی بڑی سرکاری عمارتوں کے سنگ بنیاد رکھنے سے لے کر پروگراموں اور تقاریب تک ہر جگہ سادھوؤں کا بول بالا نظر آتا ہے۔

معاشرے میں بے یقینی، ملی ہوئی کامیابی کھونے کا خوف اور عدم تحفظ کا احساس اتنا شدید ہے کہ سیاست دانوں سے لے کر صنعت کار، بزنس مین، بڑے بڑے صحافیوں اور یہاں تک کہ ملک کے چوٹی کے سائنسدانوں کی انگلیوں، ہاتھوں اور گلے میں بھی بری روحوں اور پریشانیوں سے بچانے والی انگوٹھیاں اور گنڈے وتعویز نظر آتے ہیں۔ملک میں بڑھتی ہوئی جہالت اب اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ بھارتی سائنسدانوں کے تیار کردہ راکٹ اور مصنوعی سیارے بھی اب سادھوؤں کی پوجا کے بعد ہی خلا میں بھیجے

☆ لیکچرر گورنمنٹ کالج، شاہ کوٹ

جاتے ہیں۔ یہی نہیں یہ سادھواب راکٹوں کی پرواز کا موزوں وقت بھی بتاتے ہیں۔معاشرے میں سادھوؤں اور باباؤں کا اثر اتنا بڑھ گیا ہے کئی سادھواب کھلے عام حکومتیں بنانے اور گرانے کی باتیں کرنے لگے ہیں۔اس لیے جب ایک سادھو کے خواب کی بنیاد پر مرکزی حکومت نے اناؤ کے گاؤں میں خزانے کی کھدائی شروع کرائی تو بہت سے لوگوں کو بالکل حیرت نہیں ہوئی۔کچھ دنوں پہلے پریس کونسل کے سربراہ جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ملک میں سائنسی سوچ اور نظریہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔انہیں اپنے بیان کے لیے معافی مانگنی پڑی تھی۔یہ تھی سیکولرازم کے دعویدار اور سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ''چمکتے ہندوستان'' کی ایک جھلک۔بھارت عالمی سطح پر سیکولر ہونے کا دعویدار رہا ہے۔اور شاید یہی وجہ ہے کہ ملک کا نام ہندوستان کی بجائے انڈیا قرار دے دیا گیا۔لیکن ماضی قریب میں پیش آنیوالے بہت سے واقعات سے ایسے لگتا ہے کہ برصغیر کا یہ حصہ پھر سے خود کو ہندوستان قرار دینے کے لیے بیقرار ہے۔ایک طرف جہاں ہمارے ہاں کے امن کی آشا کے علمبردار اور نام نہاد سکالرز بھارت کو ترقی یافتہ ،سیکولر اور تہذیب وثقافت کا گہوارہ تسلیم کرانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں تو وہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ بھارت اب مذہبی ہو رہا ہے۔ہندو مذہب کا اس کی خارجہ پالیسی،داخلی معاملات اور معاشرت میں اثر ورسوخ بڑھتا جا رہا ہے۔ بھارتی معاشرے کے اس بڑھتے ہوئے مذہبی رجحان کے بارے میں ہمارے ہاں کچھ بھی نہیں لکھا جا رہا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بھارت میں مذہبی انتہا پسندی اور توہم پرستی کے دن بدن نت نئے مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں۔کچھ عرصہ قبل توہم پرستی کے مخالف مشہور سرگرم کارکن نریندرا دھابولکر کو پونے میں اس وقت موٹر سائیکل پر سوار افراد نے گولی مار کر ہلاک کر دیا جب وہ ایک پل پر اپنی روزانہ کی سیر کر رہے تھے۔۶۹ سالہ نریندرا دھابولکر مہاراشٹرا کی حکومت کے ساتھ مل کر ریاست کی قانون ساز اسمبلی میں ایک قانون منظور کروانے کی کوشش کر رہے تھے۔اس حوالے سے فرانسیسی خبر رساں ادارے کی رپورٹ میں کہا گیا کہ "ہندوستان بھر میں عقلیت پسندوں پر حملہ کیا جاتا ہے کیونکہ انڈیا ابھی بھی بہت زیادہ توہم پرست ملک ہے۔جہیز،جادگروں کو پکڑنے اور کم عمری کی شادی کے خلاف قانون موجود ہیں مگر اس طرح کے کام ابھی تک ملک میں بھرپور طریقے سے ہو رہے ہیں''۔بھارتی معاشرے میں بڑھتی ہوئی توہم پرستی کے باعث ہی سادھوؤں اور روحانی گروؤں کی اہمیت میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔بھارت میں آج بھی لاکھوں بچوں کو مذہبی تعلیم اور عبادت کی غرض سے مندروں اور آشرموں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ان میں سے آئے روز بچیوں کے ساتھ گروؤں کی زیادتی کی خبریں میڈیا کی زینت بنتی ہیں تاہم کبھی بھی کسی کے خلاف ایکشن نہیں لیا گیا۔حتی کہ بعض اوقات یہ معاملہ پارلیمنٹ تک جا پہنچا لیکن بھارت کا یہ مذہبی طبقہ اس قدر طاقتور ہے کہ ان معاملات کو دبا دیا جاتا ہے۔

مذہبی مقامات کی سیاحت کا فروغ

بھارت میں بڑھتے ہوئے مذہبی رجحانات اور معاشرے کے تعلیم یافتہ افراد کا بھی ہندو مذہب کی عجیب وغریب رسومات کی طرف مائل ہونے کا اندازہ مختلف مذہبی مقامات پر جانیوالے زائرین کی تعداد سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق بھارتی دارالحکومت نئی دہلی، اقتصادی مرکز ممبئی، کولکتہ اور بنگلور کے بعد سب سے زیادہ مقامی اور بین الاقوامی سیاح ایسے شہروں کا رخ کرتے ہیں، جہاں قدیم مندر ہیں یا پھر یہ شہر کسی بھی مذہبی حوالے سے شہرت رکھتے ہیں۔گزشتہ کچھ عرصے سے مذہبی مقامات کی زیارت کرنا بھارتی معاشرے کا ایک اہم ترین حصہ بن چکا ہے۔اس سلسلے میں بالی وڈ کی فلموں اور ٹی وی ڈراموں نے بھی اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔ غریب ہو یا امیر، کوئی عام فرد ہو یا بالی وڈ اسٹار یا پھر کھیل کے میدان کی کوئی نمایاں شخصیت سبھی لوگ زائرین بن کر ایسے مقامات کا رخ کرتے ہیں۔ بھارت میں حال ہی میں ہونے والے ایک سروے سے پتا چلا کہ رواں سال مذہبی مقامات کا رخ کرنے والے مقامی سیاحوں کی تعداد ستر کروڑ سے زائد تھی جس میں ہر سال مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ان میں وہ افراد بھی شامل ہیں جو ایک ہی سال کے دوران کئی مرتبہ مقدس مذہبی مقامات کی سیر کو جاتے ہیں ۔اس سروے کا اہتمام کرنیوالے سیاحتی گروپ 'برڈ' کے ڈائریکٹر انکور بھاٹیا کے بقول زیادہ تر مقامی افراد صرف مذہبی مقامات کی زیارت میں دلچسپی لیتے ہیں۔اور یہ رجحان اتنی تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ اندازوں کے مطابق ہر سال اس میں دس فیصد تک کا اضافہ ہوسکتا ہے۔ ٹائمز آف انڈیا کے ایک سروے میں ہندوستان کے ستر فیصد اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں نے جواب دیا کہ انہوں نے کسی نہ کسی مذہبی جگہ کی سیر ضرور کی ہے ۔ بھارت کے معروف مذہبی مقام امرناتھ پر زائرین کے لئے ہیلی کاپٹر سروس متعارف کرائی گئی ہے جس کے لئے کئی ماہ پہلے بکنگ کرانی پڑتی ہے۔اس ہیلی کاپٹر سروس کو چلانے والی کمپنی کے مطابق ایک وقت میں چالیس ہزار افراد نے بکنگ کرائی۔ بھارتی کمپنیاں مذہبی مقامات پر زائرین کی سہولت کے لئے جدید ترین ہوٹلز بھی بنا رہی ہیں۔ بھارتی لوگوں کے مذہبی مقامات پر جانے کے ساتھ ساتھ مختلف روحانی شخصیات، سادھو اور گرو تواتر کے ساتھ اندرون ملک کے ساتھ ساتھ بیرونی ممالک کے دورے بھی کرتے ہیں۔ بھارت سے تعلق رکھنے والے کئی سادھو تو عالمگیر شہرت رکھتے ہیں۔آرٹ آف لیونگ کے موجودہ سربراہ شری روی شنکر نے تو کچھ عرصہ قبل اسلام آباد میں بھی اپنا سینٹر کھولا تھا۔یورپ و امریکہ میں ان کے لاکھوں چاہنے والے ہیں۔ یہ سادھو وغیرہ جب مغربی ممالک کے دورے پر جاتے ہیں تو بڑے بڑے اخبارات میں ان کی آمد کے اشتہارات دیئے جاتے ہیں۔

پراسرار اور دولت مند گرو

بھارت میں مندروں سے منسلک سادھوؤں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ان کی بہت سی کہانیاں بھی میڈیا کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ان سادھوؤں کی دولت اور سیاست و معاشرت میں اثر ورسوخ کے بارے میں ہوشربا حقائق سامنے آتے ہیں۔ بھارت کے معروف روحانی پیشوا ستیہ سائیں کے متعلق معروف برطانوی نشریاتی ادارے بی بی سی نے ایک ڈاکومنٹری بھی بنائی تھی۔کچھ عرصہ قبل جب ان کا انتقال ہوا تو سرکاری پروٹوکول کے ساتھ ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔وزیراعظم منموہن سنگھ اور کانگریس پارٹی کی رہنما سونیا گاندھی، آندھرا پردیش کے وزیراعلیٰ کرن ریڈی، لال کرشن آڈوانی اور ریاست کے سابق وزیراعلیٰ چندرا بابو نائیڈو سمیت ملک کی اہم ترین سیاسی شخصیات اور اعلیٰ سرکاری افسران نے ان میں شرکت کی۔ستیہ سائیں کے بنائے گئے ٹرسٹ کے اثاثہ جات کی مالیت کا اندازہ چارسوارب روپے لگایا گیا ہے۔ جی ہاں ایک سادھو نے اپنی زندگی میں اس قدر دولت اکٹھی کی۔ اس سے آپ بھارتی معاشرے میں سادھوؤں کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ان کے قائم کردہ ٹرسٹ کے زیراہتمام یونیورسٹی جیسے بڑے تعلیمی ادارے، سوپر سپیشلیٹی ہسپتال، عالمی مذاہب پر میوزیم، پلینی ٹیریم، پینے کے پانی کے بڑے پراجیکٹ، ریلوے سٹیشن، سٹیڈیم اور سپورٹس کمپلکس، موسیقی کا کالج، ایک ہوائی اڈہ، سکول کالج اور دنیا کے ایک سو اسی ممالک میں ستیہ سائیں بابا سینٹر وغیرہ شامل ہیں۔گویا صرف ایک سادھو نے اپنی ریاست قائم کررکھی تھی جس کا وہ بے تاج بادشاہ بھی تھا۔سائیں بابا کے مرید دنیا کے ہر کونے میں پھیلے ہوئے تھے جو عطیات کے معاملے میں پیچھے نہیں رہتے تھے لیکن شاید آئزیک ٹگر یٹ سے بڑھ کر کوئی نہیں تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۱۹۹۱ء میں اس نے اپنی کافی شاپس کی چین فروخت کرکے بابا کو ۱۰۸ ملین ڈالر دیے تھے۔ بھارت کے ایک اور مذہبی سادھو اوشو یا گرو رجنیش کی کہانی بھی کچھ ایسی ہی ہے۔اس نے بھی اپنی زندگی میں دولت کے انبار اکٹھے کیے۔وہ بھی بھارت میں نہیں بلکہ امریکہ اور یورپی ممالک میں۔۔اوشو یا گرو رجنیش کی عام شہرت یہ تھی کہ وہ جنسی آزادی کا پرچار کرتے تھے اور دولت مندوں کے گرو اور بھگوان ہیں۔وہ رولس رائس کاروں میں گھومتے اور ذاتی طیارے میں سفر کرتے۔ ۱۹۸۱ء میں وہ امریکہ منتقل ہوگئے جہاں ان کے مداحوں نے ان کے لیے ایک بہت بڑا علاقہ خریدا اور ان کے نام پر ایک الگ شہر آباد کردیا۔ بھارت کے یہ سادھو نہ صرف دولت کے انبار اکٹھے کرتے ہیں بلکہ اب ملکی سیاست اور معاشرت میں بھی اپنا اثر ورسوخ بڑھا رہے ہیں۔کچھ عرصہ قبل ایک گرو رام دیو بابا نے کرپشن کے خلاف مہم چلائی۔ بھارتی عوام اور ارکان پارلیمنٹ نے اس گرو کی تحریک میں ساتھ دیا اور پارلیمنٹ قانون سازی پر مجبور ہوگئی۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ مذہبی رہنما سیاست میں بھی اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہے ہیں۔

بالی وڈ اور کرکٹ

بھارتی میڈیا اور فلم انڈسٹری توہم پرستی اور مذہبی روایات کے فروغ میں اہم ترین کردار ادا کر رہی ہے۔بعض اوقات فلموں کے موضوعات مذہبی رسومات اور عقائد کی بنیاد پر رکھے جاتے ہیں۔ بالی وڈ کی شاید ہی کوئی ایسی فلم ہو جس میں مذہبی رسومات کی ادائیگی کا منظر شامل نہ ہو۔ پڑھے لکھے اور جدید ترین ٹیکنالوجی کے حامل ہیرو کو بھی مندر پر ماتھا ٹیکتے اور شادی کا مہورت نکالتے دکھایا جاتا ہے۔ بھارتی فلموں میں مذہبی رسومات ادا کرنے والے کو انتہائی معزز روپ میں دکھایا جاتا ہے جس سے نئی نسل میں مذہب کی طرف رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی طرح مختلف مذہبی مقامات پر شوٹنگ سے ان کی سیاحت کے فروغ میں مدد ملتی ہے۔ جب میڈیا پر مصائب سے بچاؤ اور ذہنی پریشانیوں کے حل کے لئے مذہبی سادھوؤں اور عبادات کو پیش کیا جاتا ہے تو لاشعوری طور پر عوام ان کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ بھارت کے معروف فلمساز اور اداکار فلموں کی کامیابی اور تشہیر کے لیے مندروں پر ماتھا ٹیکنے جاتے ہیں اور ان کے دوروں کی بھرپور میڈیا کوریج بھی کی جاتی ہے۔معروف بھارتی اداکارہ ایشوریہ رائے کی ابیتابھ بچن کے بیٹے کے ساتھ شادی سے پہلے اس کو ایک بار بندر اور دوسری مرتبہ ایک درخت کے ساتھ پھیرے لگانا پڑے۔ یہ سب اس لئے کرنا پڑا کہ ایک سادھو نے خبردار کیا تھا کہ اس لڑکی کے پہلے دو خاوند جلد موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔ جب کہ اسی سادھو کے کہنے پر کسی مسلمان کو مدعو نہ کیا گیا۔ کیونکہ بقول سادھو کسی مسلمان کی شرکت سے شادی شدہ جوڑے پر منحوس اثرات پڑنے کا خدشہ تھا۔مشہور بھارتی شخصیات کی جانب سے ایسی توہم پرستانہ روایات کی پاسداری کے اثرات ہی معاشرے پر محسوس کئے جا سکتے ہیں۔فلموں کے ساتھ ساتھ بھارتی ڈرامے اور کارٹونز ہندوازم کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ ان میں تو اکثر مختلف دیوی اور دیوتاؤں کے پراسرار اور مافوق الفطرت کارنامے دکھائے جاتے ہیں۔ ہندی کارٹون سیریز''چھوٹا بھیم'' بچوں میں ہندوازم کی روایات پختہ کرنے میں اہم ترین کردار ادا کر رہی ہے۔ اس میں ایک بچے کو دیوی دیوتاؤں کی طاقت کو استعمال کر کے مختلف کارنامے کرتے دکھایا جاتا ہے۔

اسی طرح بھارت میں کھیل کے میدان بھی صحت مند تفریح کی بجائے مذہبی رجحانات کے اظہار کا ذریعہ بن چکے ہیں۔ اکثر بھارتی کھلاڑی کلائیوں میں کنگن، پاؤں میں لوہے کے کڑے اور کانوں میں بالیاں ڈالتے ہیں جو کہ خاص مذہبی علامات ہیں۔ یہ سب ان کھلاڑیوں کے کروڑوں چاہنے والوں کے لئے ایک خاص پیغام ہے کہ ان کی کامیابی کا راز یہ سب مذہبی علامات ہیں جو کسی نہ کسی گرو یا سادھو سے لی گئی ہوتی ہیں۔ پاکستانی کھلاڑیوں کے آئی پی ایل کھیلنے پر پابندی بھی اس بات کا اظہار ہے کہ بھارت میں کھیل کے میدان بھی جنونی نظریات سے خالی نہیں۔ جب کبھی بھی پاکستانی کرکٹ ٹیم بھارت گئی تو شیو

سینا اور دیگر تنظیموں کی جانب سے شدید احتجاج سامنے آیا بلکہ بعض اوقات تو پچ ہی کھود ڈالی گئی۔ کرکٹ کے شائقین اس بات سے آگاہ ہیں کہ عام طور پر روایت رہی ہے کہ انٹرنیشنل میچوں میں کمنٹری انگریزی زبان میں ہوتی ہے جبکہ کھلاڑیوں کے نام اور دیگر تفصیلات بھی انگریزی میں دی جاتی ہیں۔ لیکن بھارت میں گزشتہ کچھ عرصے سے معروف چینل سٹار سپورٹس کی جانب سے کمنٹری اور دیگر تفصیلات ہندی میں فراہم کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کا اظہار ہے کہ بھارت کرکٹ اور دیگر عالمی کھیلوں کے میدان میں بھی اپنی خاص ہندو انفرادیت بنا رہا ہے۔ ان سب حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ بھارتی معاشرے کے دو اہم ترین شعبوں یعنی کھیل اور فلم انڈسٹری کے مذہبی رجحان اور توہم پرستی کا جواز ملک کی نوجوان نسل کو خاص طور پر متاثر کر رہا ہے۔

سیاست اور معاشرت میں مذہبی جنون کے مظاہر

بھارتی معاشرے میں ہندو مذہب کے اثرات انتہائی گہرے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں پختگی آرہی ہے۔ مذہب کسی بھی معاشرے میں اہم ترین مقام رکھتا ہے لیکن ہندوستان کے حوالے سے ہم یہ سب صرف اور صرف اس لیے زیر بحث لا رہے ہیں کیونکہ یہ ملک عالمی سطح پر خود کو سیکولر ریاست کے طور پر پیش کرتا ہے۔ کسی کو بھی ایک ہندو کے اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے اور مذہبی رسومات کی ادائیگی پر ہرگز اعتراض نہیں ہونا چاہیے تاہم مسئلہ صرف تب پیدا ہوتا ہے جب توہم پرستی، عجیب وغریب رسومات اور بعض اوقات تو غیر انسانی افعال سرانجام دیئے جاتے ہیں جبکہ دوسری جانب مذہبی جنون کے زیر اثر مسلمان اور عیسائیوں کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو تشدد اور اذیت کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ بھارتی معاشرہ شیوسینا اور آر ایس ایس جیسی کٹر ہندو بنیاد پرست تنظیموں کے زیر اثر بنتا جا رہا ہے۔ بعض حلقوں کا خیال ہے کہ معاشرے کے اسی بدلتے ہوئے رجحان کے تحت ہی ماضی میں سیکولر سمجھی جانے والی کانگرس اور دیگر جماعتیں بھی اب اپنی پالیسیوں کی تشکیل اور عوامی حمایت حاصل کرنے کے لئے ہندو مذہبی بنیاد پرستی کو اہمیت دینے لگی ہیں۔

کشمیری رہنما افضل گرو کی پھانسی، کنٹرول لائن پر پاک بھارت کشیدگی اور اجمل قصاب کو پھانسی دینے کے اقدامات صرف اور صرف کٹر مذہبی طبقے کی حمایت حاصل کرنے کے لئے اٹھائے گئے حالانکہ بھارت میں پچھلے کئی سال سے کسی بھی ملزم کو پھانسی کی سزا نہیں دی جا رہی تھی۔ کچھ عرصہ قبل بھارتی شہر ممبئی میں پولیس نے کالج کی دو طالبات کو صرف اس لیے گرفتار کر لیا کہ انہوں نے فیس بک پر شیوسینا کے خلاف ایک تبصرے کو پسند کیا تھا۔ بی جے پی کے بہت سے مخالفین کو خدشہ ہے کہ اگر نریندر مودی وزیراعظم بن گئے تو وہ ہندوستان کی سیکولر حیثیت ختم کر دیں گے۔ بھارت میں ذات پات کا نظام بہت

مضبوط ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں مزید پختگی آئی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہر بھارتی صدر کی نامزدگی کے موقعے پر باقاعدہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اس کا تعلق کس چھوٹی ذات یا اقلیت سے ہے۔ بھارت میں صدر کا عہدہ جو بھارتی نظام حکومت میں صرف نمائشی حیثیت رکھتا ہے زیادہ تر چھوٹی ذاتوں اور دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کو صرف اس لئے دیا جاتا ہے کہ ملک کو سیکولر ثابت کیا جا سکے جبکہ اس بات کا چرچا خود ملک کے اندر طبقاتی تفریق کا اظہار ہے۔

مذہبی تفریق اور مسلمانوں کی حالت زار

ہندوستان میں مذہب کی بنیاد پر پہلی مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق ملک کی کل آبادی ۱۰۲.۸ کروڑ ہے اور اس میں ہندوؤں کی تعداد ۸۲.۷ کروڑ ہے جو کہ پوری آبادی کا ۸۰.۵ فیصد ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق شرح پیدائش مسلمانوں میں سب سے زیادہ ہے۔ ۱۹۹۱-۲۰۰۱ء تک کی اس مردم شماری کے مطابق مسلمانوں کی آبادی کل آبادی کا ۱۳.۴ فیصد ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں ہندوؤں کی شرح پیدائش میں زبردست کمی آئی ہے۔ ۱۹۸۱-۱۹۹۱ء میں ان کی شرح پیدائش ۲۵.۱ تھی جو ۱۹۹۱-۲۰۰۱ء میں گھٹ کر ۲۰.۳ فی صد رہ گئی ہے جبکہ مسلمانوں کی شرح پیدائش ہندوستان میں سب سے زیادہ ہے اور اس میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ ان کی شرح پیدائش ۳۶ فی صد ہے جو کسی بھی برادری سے زیادہ ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی شرح پیدائش پر شدید تشویش ظاہر کی ہے۔ پارٹی کے صدر نے کہا ہے کہ اگر ہندوؤں کی شرح پیدائش گھٹتی رہی اور مسلمانوں کی بڑھتی رہی تو ملک کی سلامتی اور اتحاد خطرے میں پڑ جائے گا۔ ہندو نظریاتی تنظیم آر ایس ایس بھی ایک عرصے سے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی پر تشویش کا اظہار کرتی رہی ہے۔ بھارتی مسلمانوں کی بڑھتی آبادی پر انتہا پسند ہندو تنظیموں نے واویلا شروع رکھا ہے۔ شیوسینا، بجرنگ دل اور جنتا پارٹی کی ویب سائٹ پر پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ مسلسل اضافے سے بھارت مسلم سٹیٹ بن جائے گا۔ دوسری شادی اور ۲ سے زائد بچوں کی پیدائش پر پابندی لگا دینی چاہئے۔ بس ہندو تعصب کا ہی نتیجہ ہے کہ مسلمان گو بھارت کی سب سے بڑی اقلیت ہیں لیکن ملک کے دیوہیکل سرکاری ڈھانچے سے منسلک اہلکاروں میں صرف پانچ فیصد مسلمان ہیں۔ بھارت میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۱۳ فیصد ہے جبکہ انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس میں مسلمان صرف ۳٪ ہیں، انڈین فارن سروس میں 1.8٪ اور انڈین پولیس سروس میں 4%۔ بھارتی ریلویز میں 14 لاکھ افراد کام کرتے ہیں جن میں صرف 64,000 مسلمان ہیں جو 4.8% بنتا ہے اور اس میں سے بھی 98.7% وہ ہیں جو نچلے درجے کے ملازمین میں شمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی مسلمانوں میں خواندگی کی شرح بھی باقی ہندوستانیوں کی شرح خواندگی سے بہت کم ہے۔ ایک طرف ہر شعبے میں ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ یہ رویہ رکھا جاتا ہے تو دوسری طرف گاہے بگاہے ہندو مسلم فسادات کے

ذریعے ان کی نسل کشی کی جاتی ہے کیوں کہ ان فسادات میں ہمیشہ نقصان صرف مسلمانوں کی جان و مال کا ہی ہوتا ہے۔ اب تو بھارتی کانگرس کے رہنما راہول گاندھی نے اپنی ایک تقریر میں باقاعدہ طور پر بی جے پی پر کئی علاقوں میں فسادات کا الزام لگایا ہے۔ خدشہ ہے کہ بی جے پی اور دیگر مذہبی جماعتیں ہندو مسلم فسادات کی آڑ میں انتخابات میں کامیابی حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ دوسری جانب کانگرسی حکومت بھی الیکشن جیتنے کے لئے مذہب اور پاکستان مخالف اقدامات کا سہارا لے رہی ہے۔ بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی تعمیر کا شوشا ایک بار پھر پوری شدت کے ساتھ چھوڑ دیا گیا ہے۔ بھارت میں بڑھتے ہوئی مذہبی بنیاد پرستی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ محض چند مسخ شدہ حقائق کی بناء پر لکھی گئی کتابوں کی بنیاد پر تاریخی مساجد شہید کی جا رہی ہیں۔

بھارت میں ہندوتو ہم پرستی کا فروغ اور بڑھتا ہوا مذہبی رجحان پاکستانی معاشرے پر بھی اثرات مرتب کر رہا ہے۔ پاکستانی تاریخ کے کامیاب ترین سٹیج ڈرامے کا نام ''جنم جنم کی میلی چادر'' تھا اور سب جانتے ہیں کہ مختلف جنم ہونے کا نظریہ ہندووانہ عقیدہ ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے طلبہ پر کی جانے والی ایک تحقیق کے دوران طلبہ کو مختلف مذہبی مقامات کی تصاویر دکھائی گئیں۔ حیران کن طور پر یہ طلبہ زیادہ تر ہندو دیوی دیوتاؤں اور مندروں کو پہنچاننے میں کامیاب رہے جبکہ انہیں گنبد خضراء، مسجد اقصی سمیت کئی اسلامی مقامات مقدسہ کی پہچان تک نہ تھی۔ ہم اگر آج لکھتے اور بولتے ہوئے کسی نیک انسان کو دیوتا قرار دے دیتے ہیں تو غور کرنا چاہیے کہ کہیں اس کے پیچھے بھی ہمارے اوپر مسلط ہوتے ہندووانہ الفاظ اور ثقافتی اظہار تو نہیں؟ آپ پاکستان کے تقریباً ہر اخبار میں ستاروں کا حال پڑھ سکتے ہیں جبکہ دوست بنانے سے پہلے ستاروں کی پوچھ گچھ بھی انڈین فلموں اور ڈراموں میں کنڈلیاں ملاتے ہندو پنڈتوں کے باعث ہی ممکن ہوا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ بھارت مذہبی ہو رہا ہے اور اس کا اظہار وہاں کے ہر ہر شعبے سے واضح ہے۔ یہ ایک پیغام ہے ان لوگوں کے لیے جو بھارتی میڈیا اور بالی وڈ کی چکاچوند سے متاثر ہو کر اس سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہیں اور امیدیں اور توقعات لگائے بیٹھے ہیں اور ان لوگوں کے لئے بھی جو محض ملک کے اندر کسی گروہ کے ساتھ نظریاتی اختلاف کی بنا پر بھارت دوستی کا دم بھرتے نہیں تھکتے۔ ہمارے ہاں امن کی آشا کے علمبردار اور نام نہاد سکالرز بھارت کو ترقی یافتہ، سیکولر اور تہذیب و ثقافت کا گہوارہ تسلیم کرانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں جبکہ ہندو مذہب کا اس کی خارجہ پالیسی، داخلی معاملات اور معاشرت میں اثر و رسوخ بڑھتا جا رہا ہے۔ ہمیں بھارتی معاشرے کے اس بدلتے ہوئے رجحان کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ملکی پالیسیاں ترتیب دینے کی ضرورت ہے جبکہ دوسری جانب اس کو عوامی سطح پر ہونے والے بحث مباحثے اور میڈیا پر مذاکروں کا موضوع بنانا چاہئے تاکہ ہم اس صورتحال کا بہتر ادراک کر سکیں اور اس کے پاکستان پر ہونیوالے اثرات کا جائزہ لے سکیں۔